جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

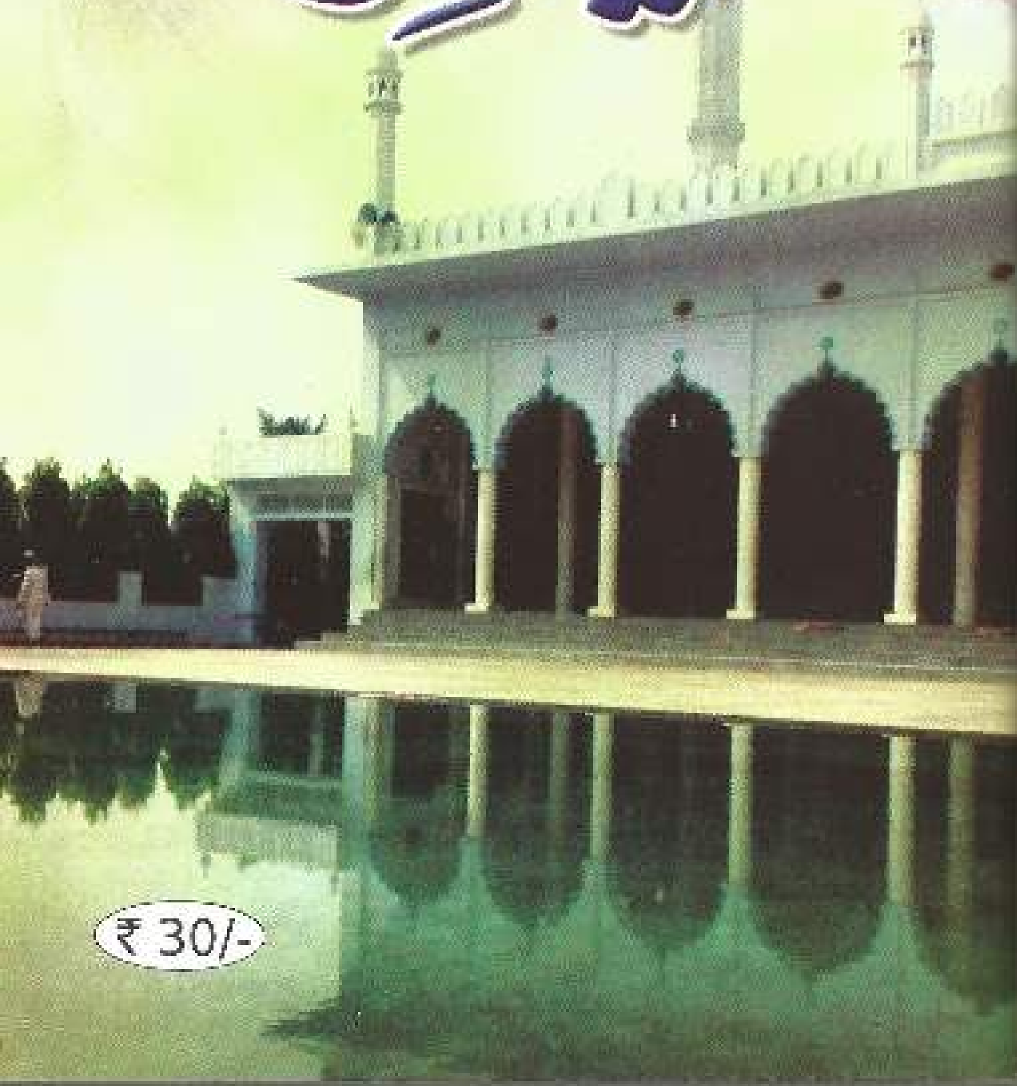

₹ 30/-

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

سہ ماہی مجلہ

حیاتِ نو

بلریا گنج

جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء

مدیر: زبیر ملک فلاحی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
انیس احمد مدنی فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

نمائندے

لندن	:	رضوان احمد فلاحی
دہلی	:	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	:	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی	:	حافظ ارشد علی فلاحی
نیپال	:	نذر الحسن فلاحی
یو اے ای	:	خالد حسن رشید فلاحی
قطر	:	محمد اکرم فلاحی
کویت	:	محمد سہیل فلاحی
سعودی عرب	:	انعام اللہ فلاحی

خط و کتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور

203-اے آر عنبر، امین آباد، لکھنؤ-18

موبائل: 9889650087 -91+

- برائے انتظامی امور و ترسیل زر

تاج محمد فلاحی جامعۃ الفلاح

بلریا گنج، اعظم گڑھ، یوپی-276121

موبائل: 9451531985-91+

ای میل: hayatenau123@gmail.com

Designing & Typing: **Al-Qalam Art**, Aminabad, Lko. M. 09958168190

فہرست مضامین

- اپنی بات (اداریہ) — زبیر ملک فلاحی — 3

مقالات

- اسلامی تصور تعلیم اور جامعۃ الفلاح — مقبول احمد فلاحی — 6
- شاہ ولی اللہ کے نظریہ ارتفاقات کی معنویت
  علماء عصر جدید کی تحریروں کا مطالعہ — ڈاکٹر ضیاء الدین ملک — 22
- علم فرض کفایہ - عصر حاضر کے تناظر میں — مسعود عالم فلاحی — 34
- الکوہل کا استعمال — ولی اللہ مجید قاسمی — 54
- حکیم محمد اکبر ارزانی اور ان کی طبی خدمات — ڈاکٹر عبدالباری فلاحی — 60
- تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو — عبدالبر اثری فلاحی — 70
- جامعہ کے لیل ونہار — عبدالرقیب فلاحی — 73
- سرکلر بنام ممبران انجمن طلبہ قدیم — سکریٹری انجمن — 77
- الوداعی نظم — نوشاد اختر اعظمی — 78

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

اپنی بات

زبیر ملک فلاحی

ادھر کچھ عرصے سے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم کا رجحان بڑھا ہے۔ خاص طور سے سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد مسلمانوں کی جماعتیں، انجمنیں اور ادارے اور ان سے متعلق نمایاں شخصیات مسلمانوں کی تعلیم بالخصوص عصری تعلیم کے لئے سرگرم ہوگئی ہیں۔ بے شمار سمپوزیم، سمینار منعقد کیے جارہے ہیں اور مستقبل کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ انجینئرنگ وغیرہ کے قائم اداروں کو بنظر استحسان دیکھا جارہا ہے اور مزید کی کوششیں کی جارہی ہیں نیز ان شعبوں کے طلباء میں اسکالرشپ تقسیم کی جارہی ہے۔

ان ساری سرگرمیوں کا محرک یہ خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ ان علوم کے ماہرین کی کمی ہے۔ چونکہ آج انھیں علوم کے ماہرین کو اچھی نوکریاں اور زیادہ نفع بخش کام ملتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو اچھی نوکریاں اور بہتر مواقع حاصل کرنے کے لئے ان علوم سے لیس ہونا چاہئے۔ یہی وقت کا تقاضا اور ترقی کا زینہ ہے۔

اعلی تعلیم کے حصول سے بھلا کس کو اختلاف ہوسکتا ہے؟ اس جذبہ واحساس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ امت مسلمہ عام امتوں کی طرح رنگ ونسل ور جغرافیائی ولسانی وحدت نہیں بلکہ ایک نظریاتی گروہ ہے۔ یہ ہر اس راستے پر نہیں چل سکتی جس پر دوسری قومیں اور امتیں سرپٹ بھاگی جارہی ہوں۔ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ہوا اور پانی کی طرح کوئی بے رنگ چیز نہیں کہ ان سے آنکھیں بند کرکے استفادہ کیا جائے بلکہ ہر نظام تعلیم اپنا ایک مخصوص فلسفہ رکھتا ہے۔ جملہ تعلیمی سرگرمیوں میں تعلیمی اقدار اور تعلیمی مقاصد بمنزلہ روح کے جاری وساری رہتے ہیں۔ اگر یہ اقدار و مقاصد صالح ہوں تو اس سانچے سے صالح افراد ڈھل کر نکلتے ہیں اور اگر یہ اقدار و مقاصد صالح نہ ہوں تو یہی تعلیمی سرگرمیاں ملک ومعاشرے کے لئے وبال جان بن جاتی ہیں۔

عصری تعلیم جسے مسلمانوں کے لئے نجات کا واحد راستہ بتایا جارہا ہے، زیادہ سے زیادہ مالی خوشحالی کی ایک سبیل ہوسکتی ہے۔ بے شک مالی خوش حالی کوئی معیوب بات نہیں۔ لیکن اسلامی نقطہ نظر سے

مادی خوشحالی کو مقصود و مدعا سمجھ لینا تعلیم کا انتہائی گھٹیا تصور ہے جو کسی طرح اسلامی تصورات سے میل نہیں کھاتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے مسلمانوں میں نظام تعلیم کو لے کر مختلف آراء سامنے آتی رہی ہیں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اب تک مسلمان ان آراء کی بنیاد پر جاری سرگرمیوں کا حساب نہیں کر سکا۔ ان تعلیمی سرگرمیوں نے امت پر کیا اثرات ڈالے، کیسے کیسے افراد پیدا کئے اس کا تجزیہ کرنا وقت کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ نظام تعلیم مغرب کا مرتب کردہ ہے۔ اس کے مقاصد مغربی مادیت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغرب کے مادہ پرستانہ مقاصد سے امت مسلمہ ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟ کیا ہم دوسروں کی پستیوں میں اس لئے اتر جائیں کہ اپنی بلندی پر قائم رہنے کے لئے محنت اور قربانیاں درکار ہیں؟ فلسفیانہ اور علمی دلائل کو جانے دیجئے۔ کیا مغربی معاشرہ ہانکے پکارے یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس نے جس نظام تعلیم کو اختیار کیا ہے اس نے افادیت پسندی، خود غرضی، حرص و ہوس، اباحیت اور بے راہ روی، اخلاقی پستی، استحصال اور حیوانیت سے پورے معاشرے کو بھر دیا ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغرب نے اپنے نظام تعلیم کو مشرقی اقوام کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا ہے۔ مغربی نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد بھی ایک طرح سے مغربی نوآبادیاتی نظام جاری ہے، بس ذرا سا فرق یہ ہوا ہے کہ ہاتھ بدل گئے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ ہاتھ کون ہیں؟ وہ دماغ کون سے ہیں جو اس نظام کو قائم کئے ہوئے ہیں؟ وہ آقا جن کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بے شمار جانیں دی گئیں وہی آج بھی آئیڈیل بنے ہوئے ہیں اور ان سے نفرت کے بجائے ہمارے سینے ان کی عقیدت اور اطاعت کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان سب کی تہہ میں اگر جائیں تو اسی نظام تعلیم کو پائیں گے جس نے ہمیں مسحور کر رکھا ہے۔ اسی نے انھیں ہم میں سے آلۂ کار فراہم کئے ہیں جو انھیں کے دماغ سے سوچتے، انھیں کی طرز بود و باش کو اپناتے اور انھیں کی بولی بولتے ہیں حق کر اپنا حصہ وصول کر کے انھیں کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ دہشت گردی کی آڑ میں مغرب جو مختلف قوموں اور ملکوں کو تاراج کر رہا ہے وہ دراصل اپنے اور اپنے ایجنٹوں کے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے۔ جو اس کی ہاں میں ہاں نہ ملائے، ان کے چشم و ابرو کے اشاروں کو خاطر میں نہ لائے اسے خود اپنے ملک میں جینے کا حق حاصل نہیں۔

مغربی نظام تعلیم فرد کو پہلے اپنے اصل سے کاٹتا، پھر انھیں اپنے رنگ میں رنگتا اور اس کے بعد

اپنے مفادات کے لئے بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ مغربی نظام تعلیم مغرب کے استحصالی منصوبے کی ایک کڑی کے طور پر کام کر رہا ہے۔

آیئے ہم اپنی گھریلو اور معاشرتی زندگی پر غور کریں، مشرقی اقدار میں رچا بسا ایک باپ کیا عصری علوم سے آراستہ پیراستہ اپنے فرزند ارجمند سے اخلاق و کردار، آداب اور پسند ناپسند وغیرہ میں صد فیصد مطمئن ہوتا ہے؟ کیا نظریہ ضرورت کے تحت بہت ساری چیزیں گوارہ بلکہ انگیز نہیں کرتا ہے؟ کالجز اور جامعات میں طلبہ کا کیا حال ہے؟ میں ترتیبی پہلو کو آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں۔ عریانی و فحاشی، رشوت کی گرم بازاری، گھوٹالے، اشیاء میں ملاوٹ، غبن اور ملک کے رازوں کی خرید و فروخت، اختیارات کا غلط استعمال اور نت نئے جرائم آخر ان سب کا مرتکب کون ہوتا ہے؟ کیا یہ جاہل، ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں کے بس کی بات ہے؟ عدلیہ کے اونچے سے اونچے فرد سے لے کر انتظامیہ کے ایک ادنی کارکن تک الا ماشاء اللہ سب ایک رنگ میں ڈوبے ہیں۔ کیا اس کا کوئی تعلق ہمارے نظام تعلیم و تربیت سے نہیں ہے؟

بچوں کی باغیانہ روش، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، والدین کے اونچے مقام سے گر کر ماں باپ کا صرف اسپانسر بن کر رہ جانا، خانگی الجھنیں، معاشرتی بے چینی، ذہنی انتشار، تنہائی کا احساس وغیرہ کی شکل میں موجودہ تعلیمی و تربیتی نظام کی سوغاتیں آپ کو اپنے آس پاس بکھری ہوئی ملیں گی۔

اعلی تعلیم سے اختلاف ممکن نہیں لیکن جب اسے مسلمانوں کی ترقی کی ضمانت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو ذہن میں ایک طالب علمانہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بغداد کی تاراجی اور سقوط اندلس کے وقت مسلمان غیر تعلیم یافتہ تھے؟ کیا ان میں اعلی تعلیم کی کمی تھی؟ جب کہ تاریخ کی شہادت اس کے برعکس ہے۔ پھر کیا ہمارے شہسوار جب دشت و جبل کو اپنے گھوڑوں کے سموں سے روند رہے تھے اور بحر ظلمات کی پایابی کا شکوہ کر رہے تھے تو موجودہ معنی میں کتنے پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ تھے؟

تعلیمی ترقی بے شک مطلوب اور محمود ہے لیکن تعلیمی ترقی عمومی ترقی کی ضامن ہے، یہ ایک ادھوری بات ہے۔ امت مسلمہ کی ترقی کا معاملہ دیگر امتوں کی ترقی سے یکسر جدا ہے۔ جو اوروں کے یہاں یافت ہے وہ یہاں زیاں ہے۔ جو اوروں کے یہاں مقصود ہے وہ یہاں ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ دنیا سے لطف اندوزی ان کی غایت حیات ہے جب کہ تعمیر جہاں ہمارا مقصد وجود ہے۔ بے شک تعمیر جہاں کے لئے علم کی۔ بلکہ علمی امامت کی۔ ضرورت ہے لیکن مقلدانہ انداز سے نہیں اجتہادی انداز سے۔ کیا اس جانکاہی کے لئے ہم تیار ہیں......؟؟؟

--------------------✧✧✧✧--------------------

اسلامی تصور تعلیم اور جامعۃ الفلاح

مقبول احمد فلاحی

علم :علم کے معروف معنی جانکاری اور معرفت کے ہیں۔ جس شے کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے وہ معلوم ہے اور جس کی معرفت نہ حاصل ہو سکے وہ نامعلوم کہلاتی ہے۔ اس نامعلوم شے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ غیر موجود بھی ہے۔ معلوم کا دائرہ نامعلوم کے مقابلے میں بہت ہی محدود ہے۔ نامعلوم کا دائرہ لامحدود اور ناپیدا کنار ہے۔ معلومات کا ایک منبع انسان کے اندر ودیعت کردہ قوتیں ہیں۔ چونکہ انسان کے اندر موجود قوتیں محدود، عارضی اور ادنیٰ درجے کی ہیں لہٰذا انسانی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات بھی محدود، عارضی اور ادنیٰ درجے کی ہوتی ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ بات بالکل درست ہے کہ خالص انسانی ذرائع سے حاصل شدہ معلومات اصل علم موجودات کے مقابلے میں کسی بھی حیثیت اور نسبت کی حامل نہیں ہیں۔

علم کا سرچشمہ موجودات عالم سے ہے اور موجودات عالم کا علم خالق موجودات کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ گویا علم کل کا مبدا و مخزن ذات خداوند قدوس ہے اور اس منبع سے حاصل شدہ علم ہی علم حقیقی ہے۔ البتہ علم ذات باری تعالیٰ کے فیضان کے مختلف ذرائع ہیں اور ان ذرائع سے حاصل شدہ علوم کا آخری مرجع بھی اسی کی ذات ہے۔ اس کے علاوہ معروف معنوں میں انسانی حواس و ذرائع سے حاصل شدہ علوم و معارف کا بھی ایک تاریخی تسلسل اور ارتقاء ہے۔ لیکن اس ذخیرۂ علم کو کلی مبنی برحق اور صواب قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ جو معلومات منبع اصلی سے مطابقت رکھتی ہوں گی وہ حق کہلائیں گی اور جو متعارض یا متضاد ہوں گی وہ ناحق اور خلاف اصل کہلائیں گی۔

العلم :العلم سے مراد وہ حقیقی اور مخصوص علم ہے جو خالق موجودات کا عطا کردہ ہو۔ العلم کے حصول کے بعض متعین ذرائع ہیں۔ بذات خود اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے منتخب نمائندے کے ذریعے انسان تک پہنچائے۔ یہ ذریعہ وحی کہلاتا ہے۔ اس وحی کی ایک قسم وہ علم ہے جسے ذات باری تعالیٰ وحی

خفی کے ذریعہ اپنے بندوں کے قلوب پر القاء کرتا ہے۔ یہ وحی خفی بھی وحی جلی ہی کی مانند ہے کیوں کہ انبیاء و رسل اللہ ہی کے فرستادہ اور اعلان شدہ نمائندہ ہیں "وما ینطق عن الھوی. ان ھو الا وحی یوحی" (النجم ۳ ۴)۔ ان انبیاء کو اللہ تعالیٰ ہی نے اپنا پیغام انسانیت تک پہنچانے کے لئے منتخب کیا ہوتا ہے اور ان کی مکمل محافظت فرماتا ہے۔ لہٰذا جو قول یا عمل ان کی جانب سے ظہور پذیر ہوتا ہے وہ براہ راست خداوند قدوس کی نگرانی، رہنمائی اور ایماء پر ہی ہوتا ہے۔ "وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیاً او من وراءِ حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنه ما یشاء انه علی حکیم"۔ کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے یا پھر وہ کوئی پیغامبر، کوئی فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔ (الشوریٰ ۵۱)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ "واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً و من الشجر ومما یعرشون" (النحل ۶۸) اور دیکھو تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا۔ اس مقام پر وحی کی تشریح صاحب تفہیم نے یوں کی ہے

"وحی کے لغوی معنی خفیہ اور لطیف اشارے کے ہیں جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ القاء (دل میں بات ڈالنے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقے سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پاتا نظر نہیں آتا، اس لئے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور القاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی انبیاء کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ الہام کو اولیاء اور بندگان خاص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور القاء نسبۃً عام ہے۔ لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا ہے۔ یہاں آسمانوں، زمین اور ملائکہ پر بھی وحی ہوتی ہے (ملاحظہ ہو سورہ حم سجدہ، سورہ زلزال اور سورہ انفال)۔ شہد کی مکھی کو بھی اس کا پورا کام وحی (فطری تعلیم) کے ذریعہ سکھایا جاتا ہے، جیسا کہ آیت مذکورہ میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ وحی شہد کی مکھی تک محدود نہیں ہے۔ مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا، اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی سکھایا کرتی ہے۔ پھر ایک انسان کو غور و فکر، اور تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب رائے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے۔" واوحینا

الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ" (القصص) اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے۔ دنیا میں جتنے اکتشافات ہوتے ہیں، جتنی مفید ایجادیں ہوئی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصلحین نے معرکے کے کام کئے ہیں ان سب میں اسی وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آ گئی، یا کوئی تدبیر سوجھ گئی، یا خواب میں کچھ دیکھ لیا اور بعد میں تجربے سے یہ پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم اس وحی کی ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کئے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آ رہی ہے اسے اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد، احکام، قوانین و ہدایات پر مشتمل ہوتی ہیں اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعے نوع انسانی کی رہنمائی کر سکے۔"

اس علم کے علاوہ خالق کائنات کی جانب سے علم عطائی کی بعض دوسری اقسام بھی ہیں جن میں سے بعض صرف انسانوں کے لئے مخصوص ہیں اور بعض انسان کے ساتھ دیگر مخلوقات کو بھی بقدر ظرف وظرف حاصل ہے۔ اس علم عطائی کا اظہار مختلف انداز سے تاریخ کے مختلف ادوار میں عالم وجود میں ہوتا رہا ہے۔

علم عطائی کی چند شکلیں

۱۔ **استدلالی**: یہ علم صرف انس و جن کے لئے مخصوص ہے۔ انسان کو سمع، بصر اور فواد کی بیش بہا دولت سے نوازا گیا ہے، ان قوتوں سے معلومات کی بنیادیں فراہم کی جاتی ہیں اور پھر استدلال کے ذریعہ کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ نتائج درست بھی ہو سکتے ہیں اور نادرست بھی۔ اس کی درستگی کا معیار العلم ہے، اگر نتائج العلم کے موافق یا کم از کم متعارض نہیں ہیں تو درست ہو سکتے ہیں اور اگر متعارض یا متضاد ہیں تو نادرست اور خلاف حق ہیں۔ اس نوعیت کے استدلالی علم کو العلم کے بجائے علم عام یا ظن کہنا مناسب ہے۔

۲۔ **ادعائی**: اس علم کی بنیاد استدلال کے بجائے دعویٰ ہے۔ اس دعویٰ کی بنیاد انسان کے احساسات، جذبات، افتاد طبع اور قلوب پر وارد ہونے والے خطرات ہوتے ہیں۔ یہ ادعات درست بھی ہو سکتے ہیں اور نادرست بھی۔ اگر من جانب اللہ ہیں تو درست اور اگر شیطانی وساوس یا دیگر اسباب و علل کے تحت ہیں تو قطعی نادرست یا کم از کم ظن کے درجے میں آئیں گے۔ ان ادعائی علوم کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی العلم ہی ہے۔ اگر العلم سے متعارض نہیں ہیں تو درست ہو سکتے ہیں اور اگر متعارض ہیں تو قطعی غلط، کذب اور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے صالح بندوں کے قلوب پر بعض غیر واضح

امور میں القاء و الہام کے ذریعہ رہنمائی فرماتا ہے یا پھر شیطانی واردات ہوتے ہیں جن سے اکثر لوگ خود دھوکہ کھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکے میں مبتلا کرتے ہیں۔

۳۔ **وھبی یا لدنی**: علم و معرفت کی ایک شکل وہ ہے جسے وہبی کہا جا سکتا ہے۔ اس علم کی بنیاد اشیاء کی تخلیقی خمیر سے ہے اور تخلیقی خمیر کا منبع خالق کائنات کی ذات ہے۔ وہبی معارف میں ارتقاء اور نمو کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ اس علم کے ذریعہ اشیاء اپنا وجود باقی رکھتی ہیں، خلاف معمول واقعات و حوادث سے مطلع ہوتی اور حفظ ماتقدم کی تدابیر اختیار کرتی ہیں۔ علم کی اس قسم کا نہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے خطاء و صواب کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے تسلیم نہ کرنے پر جہالت کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا رخ اکثر ذاتی اور انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بفرض محال کبھی اگر یہ وہبی علوم العلم سے متعارض ہو جائیں تو اسے وہبی کے بجائے شیطانی وساوس و خطرات سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے یا کسی قلبی، دماغی خلل اور مرض کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہئے۔

انسان اور علم: دنیا اور اہل دنیا کی بسلامت گزر بسر کے لئے بعض بنیادی سوالات کا جواب ناگزیر ہے اور درست جوابات ہی علم کی بنیاد ہیں۔ مثلاً

☆ اس کائنات و موجودات کا خالق کون ہے؟

☆ موجودات عالم کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہیں یا کسی سوچے سمجھے عظیم منصوبے کا حصہ ہیں؟

☆ موجودات عالم میں انسان کا کیا مقام ہے؟

☆ دنیا و اسباب دنیا کی کیا حقیقت ہے اور اس دنیا سے انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

☆ نظام کائنات (معلومات و غیر معلومات) میں دنیا اور اہل دنیا کی تخلیق کا کیا راز ہے؟

☆ کائنات بطور خاص انسان کا مبدا کیا ہے اور اس کی منزل کیا ہے؟

☆ یہ نظام عالم از خود پورے انضباط کے ساتھ رواں دواں ہے یا کوئی کارفرما قوت پورے نظام کو ہانک کر کسی آخری منزل کی طرف لے جا رہی ہے؟

☆ وسائل حیات کی کیا حیثیت ہے، وسائل کا استعمال کیسے کیا جائے، کس تدریج و توازن سے استعمال ہو کہ خیر و برکت کا فیضان ہو اور کن بے تدبیریوں سے شر و فساد اور تباہی و بربادی ظہور پذیر ہوگی؟

☆ جملہ امور کائنات میں عدل و قسط، اعتدال و توازن اور صراط مستقیم کیا ہے؟

☆ معلومات کے علاوہ نامعلومات یا غیب کی دنیا کتنی وسیع ہے اور اس غیب کے پردے میں کون سی اہم اور بنیادی حقیقتیں پوشیدہ ہیں؟ وغیرہ

تاریخ انسانی کے ہر دور میں ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوششیں کی گئیں ہیں، مگر جو جوابات انسان نے صرف اپنے علم و دانست سے دینے کی کوشش کی ہے، وہ محدود، ناقص، عارضی اور ادنیٰ درجے کے ہیں۔ کسی بھی جواب کو یقین کا مقام حاصل نہیں ہو سکا، بس ظن و تخمین کی حد تک ہی تخیلات کی پرواز ہو سکی ہے۔ درست بات صرف اور صرف یہ ہے کہ ان سوالات کا قطعی اور صائب جواب دے پانا انسان کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ درست جواب اور اس جواب پر تعمیر نظام عالم کے بغیر موجودات میں توافق و ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور جب توافق و ہم آہنگی متاثر ہوگی تو نتیجہ شر و فساد اور تباہی و بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ اس لئے لازم ہے کہ اس حقیقت کو تسلیم کیا جائے کہ بیادور اس نوعیت کے بنیادی سوالات کے جوابات وہی ذات اقدس دے سکتی ہے جو علیم و خبیر اور موجودات عالم کی خالق ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر جو جوابات دیئے جائیں گے اسے العلم یا علم نافع بہر حال نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ظن و تخمین ہی کا نام دیا جا سکتا ہے جب کہ واضح امکان موجود ہے کہ یہ ظن ہوائے نفس کا نتیجہ ہو۔ لہٰذا مسئلہ علم پر ابتداء ہی میں درج ذیل امور طے کر لینے چاہئیں:

☆ تخلیق کائنات اور اس کا متوازن ارتقاء ایک مضبوط منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔
☆ کائنات کا ایک خالق اور رب ہے اور وہ حی و قیوم ہے۔
☆ روئے ارض پر نسل انسانی کا آغاز پوری روشنی، منصوبہ بندی اور علم کے ساتھ ہوا ہے۔
☆ انسان روئے ارض پر اللہ رب العزت کا خلیفہ ہے اور وہی خلیفہ اشرف المخلوقات اور مسجود ملائک ہے نیز دیگر موجودات و مخلوقات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔
☆ منصب خلافت کی بطریق احسن انجام دہی کے لئے خالق نے اپنے خلیفہ انسان کو علم و شعور کی دولت سے نوازا ہے۔
☆ وہی علم و آگہی معتبر اور نظام عالم سے ہم آہنگ ہوگا جس کا سر رشتہ ذات خداوند قدوس سے مربوط ہو۔
☆ علم و شعور کا ایک ارتقائی تسلسل ہے جو اصل بنیادوں پر روز قیامت تک بڑھتا اور پھیلتا رہے گا۔
☆ بقدر ظرف و تحمل تمام افراد، اقوام و ملل اور اجناس کو علم و آگہی سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔
☆ علم و آگہی کا معدن، منبع اور مخرج ذات باری تعالیٰ ہے جو مختلف ذرائع سے اپنی مخلوقات کو بقدر ضرورت و استطاعت نوازتا رہتا ہے۔
☆ غیر انسان کو بھی ان کی تخلیقی ساخت اور مقصدیت کے اعتبار سے متنوع علوم و معارف

سے نوازا گیا ہے۔
☆ العلم یا علم حقیقی وہ ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے انبیاء و رسل کی معرفت انسانیت تک پہنچاتا رہا ہے اور یہی وہ بنیادی علم ہے جو جملہ علوم و معرفت کو درست سمت سفر فراہم کرتا ہے۔
☆ علم حقیقی سے بے نیاز ہو کر علوم کی توسیع نظام عالم کے لئے ضرر رساں ہے۔ بالفاظ دگر یہ علم غیر نافع کے زمرے میں آتا ہے۔
☆ علم حقیقی کے تمام سابقہ ابواب بسبب انسانی تحریفات غیر معتبر ہو گئے ہیں۔ اب روئے ارض پر وہی علم معتبر اور حقیقی ہے جو سیدنا حضرت محمد ﷺ کی معرفت انسانیت تک پہنچا ہے۔
☆ منصب خلافت کی انجام دہی کے لئے العلم کی بنیاد پر جملہ علوم و معارف سے آگہی ضروری ہے۔ العلم کی بنیاد پر سمع، بصر اور فواد کی قوتوں کو بروئے کار لا کر اس محاذ پر پیش رفت، روئے زمین کی تعمیر و ترقی اور آرائش و زیبائش خلیفۃ الارض کا منصبی فریضہ ہے۔
☆ موجودات عالم میں انسان اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے۔ اس کی تخلیق کا مقصد احکامات و مرضیات خداوندی کی تکمیل اور دیگر مخلوقات کی خیر خواہی ہے۔

استدلال: " الرحمن. علم القرآن. خلق الانسان. علمه البيان. الشمس والقمر بحسبان. والنجم والشجر يسجدان. والسماء رفعها ووضع الميزان. الا تطغوا في الميزان واقيموا الوزن بالقسط ولا تخسروا الميزان. " (سورہ رحمٰن)

آیات بالا کا ما حصل: خالق کائنات کی صفت رحمت اس کی ساری صفات حسنیٰ پر غالب ہے۔ اس نے بربنائے رحمت انسان کو العلم یعنی علم قرآن سے نوازا۔ علم قرآن اس زبردست علیم و خبیر کا انسانیت پر براہ راست فیضان رحمت ہے۔ اس ذات خداوند قدوس نے کائنات و موجودات میں انسان کو اپنی شاہکار مخلوق کے بطور پیدا فرمایا اور اسے سمع، بصر اور فواد کی قوت بے بہا ودیعت فرمائی جس کے ذریعہ وہ قرآنی اور الٰہی علوم کی بنیاد پر معاون اور نفع بخش علوم و معارف کا عظیم الشان محل تعمیر کرتا ہے۔ یعنی قرآنی علوم و معارف کی توضیح و تبیین کرتا ہے۔ علوم و فنون کی ژولیدگیوں کو قرآنی علوم کی شاہ کلید سے سلجھاتا چلا جاتا ہے اور جملہ علوم کو علم نافع کی شکل دیتا ہے۔ خلاق عالم کی نظر میں علمی وسعت و ہمہ گیریت کا مرکز و محور متوازن اور متناسب کائناتی ارتقاء ہے۔ اس لئے کہ سورج، چاند، ستارے سیارے، شجر و حجر، ناپیدا کنار وسیع افلاک اور اس کی موجودات میں کمال درجے کی ہم آہنگی اور بے مثال توازن ہے۔ بنابریں انسان جو قدرت کی شاہکار تخلیق ہے اور جسے امور کائنات میں بعض مخصوص قوتوں کے ذریعہ تصرفات کا اختیار بخشا ہے اسے ان خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کرتے وقت

کائناتی اعتدال وتوازن کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے۔

خالق کائنات کی منشاء ومرضی یہ ہے کہ تمام تر ترقیات واکتشافات کے ساتھ اس نکتے کو پیش نظر رکھا جائے کہ نظام کائنات میں جو عدل وقسط اور اعتدال وتوازن ہے اس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ عدل وقسط اور اعتدال وتوازن کے ساتھ علوم کی توسیع اللہ کو مطلوب ہے اور ان شرائط کی تکمیل کی بنیاد" اقراء باسم ربک الذی خلق " ہے۔ جو کچھ پڑھا پڑھایا جائے اس کی بنیاد میں اسم رب لازماً شامل ہو اور اسم رب کی شمولیت ہی کے طفیل والسماء رفعها ووضع المیزان .الا تطغوا فی المیزان کا مطلوب ہدف حاصل کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ علم کا معدن ذات باری تعالیٰ ہے۔ وہی معلم اول اور معلم حقیقی ہے۔ اسی نے انسان کو بطریق احسن روئے ارضی پر منصب خلافت کی انجام دہی کے لئے علم الاسماء سے نوازا ہے۔ اسی نے تمام انبیاء بھیجے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الرسل بنا کر دنیا میں مبعوث فرمایا۔ نبیؐ نے تعلیم کی بنیاد اقراء باسم ربک. پر استوار کی اور اپنے بارے میں اعلان فرمایا بعثت معلما ۔ آپؐ نے کلام الٰہی کی توضیح وتبیین کے ذریعہ علوم کی ترقیات کا راستہ ہموار کیا اور نشان راہ متعین فرمایا اب قرآن وسنت کی بنیاد پر علوم کی توسیع امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے۔ اسی احساس ذمہ داری کے تحت تقریباً دس صدیوں تک ملت اسلامیہ تمام علوم میں قائدانہ مقام پر نظر آتی ہے۔ تعلیم وتعلم کا تعلق براہ راست اللہ اور اس کے رسول یا قرآن وسنت سے ہے لہٰذا روئے زمین پر سب سے بہترین لوگ وہ ہیں جو تعلیم وتعلم کے عمل سے وابستہ ہیں۔

مسئلۂ تعلیم اور جامعۃ الفلاح :

بیسویں صدی میں عالمی سطح پر احیائے اسلام کی کوششوں کا از سر نو آغاز ہوا۔ نئے دم خم کے ساتھ تحریکات اسلامی نے اسلام کے روئے تاباں کی آرائش وزیبائش پر توجہ دی۔ اسلام کو ایک زندہ حقیقت بلکہ انسانیت کے جملہ دنیوی واخروی مسائل کے حل کے طور پر مضبوط دلائل کے ساتھ عصری افکار ونظریات کے بالمقابل زور وشور کے ساتھ پیش کیا۔ تحریکات اسلامی نے جملہ معروف شعبہ ہائے حیات سے بحث کی اور ان مباحث کا ایک اہم باب مسئلہ تعلیم بھی ہے۔ مسئلہ تعلیم کی اہمیت کے پیش نظر اس جانب توجہ ضروری بھی تھی اور اب بھی تحریکات اسلامی کو اس محاذ پر پہلی فرصت میں کافی اور خصوصی توجہ صرف کرنی چاہئے، کیونکہ دیگر شعبہ جات کی توضیح وتعبیر کی بنیاد بھی اسی مسئلہ تعلیم ہی سے متعلق ہے۔

اللہ کا شکر ہے تحریکات اسلامی نے حالات حاضرہ کے تناظر میں قرآن وسنت کی توضیح وتعبیر جدید اسلامی لٹریچر کے حوالے سے بہتر طور پر کی ہے اور اس کا گراں قدر سلسلہ جاری ہے۔ اصحاب فکر ونظر کو

تفکر، تدبر اور حالات پر اسلامی تعلیمات کے انطباق کا ایک مثبت زاویہ نظر دیا ہے جس کی روشنی میں لوگ اپنے علم ومعرفت کے مطابق اس سلسلہ میں گراں قدر اضافہ کر رہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی تحریک اسلامی سے وابستہ اور غیر وابستہ افراد کے ایک بڑے طبقہ کے انداز فکر ونظر میں کافی نکھار آیا ہے۔ دیگر مسائل کی مانند مسئلہ تعلیم پر بھی مسلم دانشوروں کی جانب سے وقتاً فوقتاً رشحات قلم منظر عام پر آتے رہتے ہیں اور جستہ جستہ یک گونہ غیر منضبط اور غیر مربوط انداز میں ہی سہی تعلیمی محاذ پر جد وجہد کا سلسلہ بھی پوری دنیا میں جاری ہے مگر مسئلہ کی نزاکت واہمیت کے پیش نظر کوششوں میں جو باقاعدگی ہونی چاہئے وہ کہیں نظر نہیں آتی ہے۔

علوم کی تدوین جدید کا ایک مرحلہ ابتدائیہ کا دوسرا متوسطہ کا اور تیسرا علیا کا ہے۔ علیا کی وسعت اور گونا گونی کے پیش نظر اس مرحلہ کی مقتضیات وتفصیلات کی تعیین کو موخر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ابتدائیہ اور متوسطہ پر تفصیلی خاکہ نہ صرف موجود ہونا چاہئے بلکہ موجود وسائل وذرائع کے مدنظر اس پر قابو بھی پایا جاسکتا تھا۔ اور اگر اس سطح پر مناسب انداز سے کام ہو جائے تو بلاشبہ علیا کی صورت گری آسان ہو جائے گی، ساتھ ہی مختلف شعبہ جات تعلیم میں رنگ بھرنے کے لئے ایک منضبط خاکہ میسر آسکتا ہے۔

ملت اسلامیہ کو ان کوششوں کی قدر کرنی چاہئے جن کا آغاز تحریک اسلامی ہند نے اپنی تاسیس کے بالکل ابتدائی ایام ہی میں کر دیا تھا۔ درست تصور تعلیم کے ساتھ ملک کے طول وعرض میں متعدد ابتدائی اور پرائمری درجات کی درسگاہیں قائم ہوئیں، اسلامی تصور تعلیم کی بنیاد پر درسی مضامین کی ترتیب وتدوین پر توجہ دی گئی، درسیات کی تیاری میں اسلامی تصور تعلیم کی کافی حد تک رعایت کی گئی۔ بجا طور پر اسے ایک کامیاب تجربہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر درست بات یہ ہے کہ یہ ایک مستقل ترقی پذیر عمل ہے۔ سال بہ سال ان کتابوں کو موافق حال بنانے اور جدید تعلیمی اکتشافات کے مطابق درسیات کو اپ ڈیٹ کرنے کا عمل جاری نہ رہنے کے باعث خواہش کے باوجود ان درسگاہوں کو تعلیمی دنیا میں مناسب جگہ نہیں مل سکی یا پھر رفتہ رفتہ ان درسگاہوں کے نصاب میں غیر نظریاتی کتابوں کو شامل کیا جانے لگا۔ اگر ڈھنگ سے توجہ کے ساتھ اس نظریاتی عمل کو جاری رکھا جاسکتا تو اب تک کم از کم مسلمانوں کے زیر انتظام قائم پرائمری درسگاہوں کے لئے ان کتابوں کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے ماہرین تعلیم اور مطلوبہ وسائل کی کمی کے سبب یہ مفید عمل متاثر ہوا ہو۔ اسی طرح متوسطہ کے لئے سوچ، خواہش اور عوامی طلب کے باوجود کوئی منضبط نظام تعلیم اور نصاب تعلیم اب تک مرتب نہیں کیا جاسکا ہے۔ ذہنی وفکری وسعت برابر متقاضی ہے کہ درسیات اور ان میں رنگ بھرنے والے اساتذہ کی ایک ٹیم تیار ہو مگر اس محاذ پر بھی کوئی قابل ذکر کام نظر نہیں آتا ہے۔ اسی پر اعلیٰ شعبہ جات کے علوم کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

زندگی کے متنوع مضامین کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کم از کم اسلامیات، دینیات، دعوت وغیرہ کے لئے تھوڑی توجہ دے کر اختصاص کے مرحلے کے مضامین کی ترتیب تو ممکن ہی تھی مگر یہاں بھی چند منتشر کوششوں کے علاوہ کوئی قابل ذکر کام نظر نہیں آتا ہے۔

جامعۃ الفلاح جدید اسلامی تصور تعلیم کے تحت خالص تحریک اسلامی کی کوششوں سے معرض وجود میں آیا ہے۔ مذکورہ بالا اساسی تصورات کے پس منظر میں جامعہ کی خدمات کو دیکھا جانا چاہئے۔ جامعہ کے قیام کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو نہایت وضاحت کے ساتھ یہ تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے کہ اس کی خدمات کافی حد تک نہایت اہم اور قابل قدر ہیں۔ بالکل اجنبی ماحول میں خالص اسلامی تصور تعلیم کے تحت دور جدید کے تقاضوں کے موافق کسی تعلیمی ادارے کا قیام اور حتی المقدور اس کی لوازمات کی فراہمی جامعہ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جامعہ نے ابتدائیہ، متوسطہ اور علیا تینوں سطحوں پر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اب تقریباً پچاس سال گزر جانے کے بعد ہندوستان میں اسلامی تصور تعلیم کے ماڈل کے طور پر جامعہ کو سامنے رکھ کر از سر نو غور و فکر کرنے اور درج ذیل پہلوؤں سے جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

☆ اسلامی تصور تعلیم فی الواقع کیا ہے؟ ☆ اس تصور کے آئینے میں جامعہ کا کیا مقام ہے؟ ☆ ابتدائیہ میں کتنی کامیابی مل سکی ہے اور کون کون سے پہلو توجہ طلب ہیں؟ ☆ ابتدائیہ کی تشکیل جدید کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جانی چاہئے؟ ☆ متوسطہ کی صورت حال کیا ہے؟ ☆ اس شعبہ میں اب تک کیا کیا گیا ہے اور کیا کرنا باقی ہے؟ ☆ اس شعبہ کے لئے کیا نظام و نصاب مناسب ہے؟ ☆ علیا کی تشکیل کی کیا صورت مناسب ہے؟ ☆ دیگر شعبہ جات علوم میں اسلامی تصور تعلیم کی اساسیات کو کس طرح سمویا جائے؟ ☆ ہر سطح پر درسیات کی تیاری کی صورت حال کیا ہے اور اب درسیات کی تیاری کا لائحہ عمل کیا ہو؟ وغیرہ

ان سوالات کے جواب میں بحیثیت مجموعی درج ذیل احساسات سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ابھی تک کوئی واضح نقشہ سامنے نہیں آسکا ہے لہٰذا اسلام کے تصور تعلیم کی مزید توضیح و تنقیح کی ضرورت ہے۔

۲۔ جو کچھ تصورات موجود ہیں ان پر ٹھوس انداز سے منصوبہ بند کوشش نہیں ہوسکی ہے۔

۳۔ جو کوششیں اب تک ہوسکی ہیں وہ اس لائق نہیں ہیں کہ دنیائے تعلیم و تعلم میں بطور نمونہ یا ماڈل انھیں پیش کیا جاسکے۔

ان یک گونہ منفی نتائج کے پس منظر میں بعض ناخوشگوار سوالات بھی ابھرنے لگے ہیں۔ افسوس کہ

اس نوعیت کے سوالات ان افراد کے ذہنوں میں پیدا ہونے لگے ہیں جنھیں بظاہر اسلامی تصور تعلیم کا علم بردار ہونا چاہئے۔ مثلاً اسلام کا جو تصور تعلیم پیش کیا گیا ہے وہ عملی کے بجائے تخیلاتی اور تصوراتی ہے۔ آج کے دور میں یہ تصورات ناقابل عمل ہیں۔ یا حکومتی وسائل و ذرائع کے بغیر ان تصورات میں رنگ بھرنے کی کوشش سعی لاحاصل ہے۔ یا فی الواقع قرآن و سنت میں اسلامی تصور تعلیم کا کوئی واضح نقشہ موجود ہی نہیں ہے۔ اسلامائزیشن آف نالج کی کوشش تکلیف مالا یطاق کے زمرے میں آتی ہے وغیرہ۔ صورت حال کی ایک تعبیر تو یہ ہے جو اوپر کے جملوں سے کی جاتی ہے، لیکن مختلف وجوہ سے اس تعبیر کو درست نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی مسئلہ کی حسب منشاء توضیح و تعبیر سامنے نہ آنا اس بات کی دلیل نہیں بن سکتی کہ فی الواقع وہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔

صحیح صورت حال:

موجودہ صورت حال کی درست تعبیر یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مکمل کل ہے جو پوری کائنات اور اس کی موجودات کی ہر معاملہ میں رہنمائی کرسکتا ہے۔ تعلیم و تعلم جیسے نہایت بنیادی اور اہم شعبے سے کیسے صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی کوششوں میں اس مسئلہ کی جانب کماحقہ توجہ نہیں دی جاسکی ہے گویا ترقی پذیر دنیائے انسانیت میں اسلامی تصور تعلیم کی توضیح و تشریح اور تبیین و تعبیر پر جس قدر توجہ مطلوب ہے وہ توجہ نہیں دی جاسکی ہے جس کی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے ذہنوں میں تعلیم سے متعلق طرح طرح کے سوالات سر اٹھانے لگے ہیں۔

یہ صورت حال اہل اسلام بطور خاص ان لوگوں کے لئے جو اسلامی نظریہ تعلیم پر یقین رکھتے ہیں ایک زبردست چیلنج بھی ہے کیوں کہ یہ جواب تو دینا ہی ہوگا کہ اسلام کا کوئی منضبط اور مربوط تصور تعلیم اور نظام تعلیم ہے بھی یا نہیں اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ اگر نظری طور پر پیش بھی کر دیا جائے تو پھر سوال ہوگا کہ یہ نظریہ قابل عمل ہے بھی یا نہیں اگر عملی ہے تو مثال پیش کی جائے یا اگر اساسیات موجود ہیں تو ان کی توضیح و تعبیر کیوں نہیں ہورہی ہے۔ اور اگر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ تصور تعلیمی محاذ پر اپنا وجود نہیں منوا پا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی توجہ طلب ہے کہ ابتدائی نوعیت کے جو تجربات مختلف مقامات پر ہورہے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے۔ حسن و قبح پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے اور مستقبل کی ٹھوس منصوبہ بندی کی جائے۔ مرحلۂ ابتدائیہ پر جو کام ہوئے اس کی پیش رفت کا جائزہ لیا جائے۔ متوسطہ کے کام کی نوعیت کیا ہے۔ کہاں کہاں خلا ہے اس کو پر کرنے کی کیا منصوبہ بندی کی جائے۔ اسی طرح اعلیٰ شعبہ جات تعلیم کو کیسے آگے بڑھایا جائے کس ترتیب کے ساتھ فکری و عملی کوششیں ہوں۔ سطور ذیل میں انھیں پہلوؤں پر گفتگو کی جارہی ہے۔

۱۔ اس امر واقع کا انکار ممکن نہیں کہ ملت اسلامیہ کے منصوبوں میں بہت زیادہ حکمت عملی کسی میدان میں نظر نہیں آتی ہے حالانکہ اقدامات اور دنیا میں تغیرات کے لئے مضبوط منصوبہ بندی ہر محاذ پر بہر حال ضروری ہے۔ تعلیم کے محاذ پر منصوبہ بندی کی صورت حال بہتر نہیں ہے۔ اگر چہ دیگر شعبہ جات حیات میں انفرادی، ادارہ جاتی یا جماعتی منصوبہ بندیاں اور ایک تدریج و تسلسل کے ساتھ قدم بہ قدم پیش رفت بھی دیکھی جاسکتی ہے مگر تعلیمی محاذ پر پیش رفت کی صورت حال دیگر شعبہ جات سے بھی ابتر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک مرحلہ میں بعض بنیادی تصورات تو منظر عام پر آگئے مگر پھر اس سلسلہ کو لے کر آگے بڑھنے کی کوئی خاص کوشش نہیں ہوئی ہے۔

بعض حلقوں سے یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جن اساسیات پر اسلامی تصور تعلیم کی بات کی جا رہی ہے یہ بنیادی تصورات تو کم و بیش دیگر مذاہب اور اقوام و ملل میں بھی موجود ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ تمام تر وسائل کے باوجود عیسائی تصور تعلیم، یہودی تصور تعلیم، ہندو تصور تعلیم یا ایسا کوئی تصور تعلیم جس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہو کہیں موجود نہیں ہے۔ آج کا پورا انتظام تعلیم خدا بیزاری ہی کی بنیاد پر کیوں قائم ہے اور سارے مذاہب والے پورے اطمینان کے ساتھ اس سے پورا پورا فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ یورپ، امریکہ، اسرائیل، ہندوستان کسی جگہ کسی سطح پر بھی نظام تعلیم کو مذہبی تصورات پر قائم کرنے کی کوشش کیوں نہیں ہوئی۔ اس کا بہت سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب اپنے عمل کا نہایت محدود دائرہ رکھتے ہیں اور اسی محدودیت کی وجہ سے سیاسیات، معاشیات، ریاضیات فلکیات غرض کہ کسی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے ان مذاہب میں فی الواقع کوئی اساس موجود نہیں ہے جب کہ اسلام کا معاملہ ان سب سے الگ ہے۔ اسلام مکمل نظام حیات ہے اور اس میں کائناتی ضروریات کی سو فیصد تکمیل کا سامان موجود ہے۔ اور یہ بذات خود اس کے آخری اور مکمل خدائی ہدایات و تعلیمات ہونے کی بین دلیل بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام تمام شعبہ ہائے حیات سے بحث کرتا ہے اور خدائی ہدایات و تعلیمات کی اساس پر ایک نہایت کامیاب متبادل پیش کرنے کی قوت کا اظہار کرتا ہے۔ اور یہ اظہار اتنا مدلل اور بامعنی ہے کہ ہر سطح پر اس کی معقولیت کے وزن کو تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اور یہی تسلیم ہی پوری دنیا کے لئے زبردست چیلنج بن گیا ہے۔ پھر کیوں نہ انتظام حیات کے بنیادی مرکز یعنی مسئلہ تعلیم کو مضبوط کیا جائے اور ایسا انتظام تعلیم متعارف کرانے کی کوشش کی جائے جو آج کی تمام تہذیبی دنیا میں انقلاب کی بنیاد بن سکے۔

آج جس طرح ہر سطح پر غیر الٰہی تصورات کے سبب عوامی بے چینی اور اضطراب ہے، اور تمام شعبہ ہائے حیات میں مروج تصورات کی ناکامیاں منظر عام پر آ رہی ہیں اور اسلام کے دکھائے ہوئے

راستے پر لوگ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، اسی طرح تعلیمی محاذ پر بھی سخت بے چینی اور اضطراب پایا جا رہا ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام اور اس کے کڑوے کسیلے ثمرات کے مدنظر اصحاب فکر و نظر تعلیم کی موجودہ اساسیات پر بڑے گہرے سوالات کھڑے کر رہے ہیں اور انھیں اساسیات ہی کو نہ صرف تعلیمی دنیا بلکہ عمومی بے راہ روی اور بے سمتی کو ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ضرورت ہے کہ ارباب فکر و نظر مسئلہ زیر بحث میں اسلامی نقطہ نظر سے رہنمائی کے لئے سامنے آئیں اور ممکنہ وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اس جانب سنجیدہ توجہ مبذول فرمائیں۔

اسلامی تصور تعلیم کے تحت منصوبہ بندی کے قابل ذکر اہم اجزاء۔

۱۔ ایسے ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جو امہات العلوم کے ساتھ جدید ترقی یافتہ علوم پر بھی ماہرانہ نظر رکھتے ہوں۔

۲۔ صرف منصوبہ بندی پر ایک خطیر رقم مختص کی جانی چاہئے اور کمیٹی دو سال کے اندر تعلیمی نظام کا خاکہ مرتب کرے۔

۳۔ یہی کمیٹی پوری دنیا میں ہونے والے انفرادی و ادارہ جاتی کوششوں اور تجربات کا جائزہ لے اور حاصلات کو مرتب کرے۔

۴۔ کمیٹی اسلامی تصور تعلیم، اس کی اساسیات، مقاصد اور طریقہ کار کی تعیین بھی کرے۔

۵۔ اس نصابی خاکہ میں رنگ بھرنے والے افراد کی مناسب تربیت کا نظم کرے۔ بطور خاص تربیت اساتذہ کا مستقل اور معقول انتظام کیا جائے۔

۶۔ پہلے مرحلہ میں ماڈل اسلامی اسکول کا خاکہ پیش کرے اور دوسری طرف اس خاکہ کے مطابق عملی اقدامات کا آغاز کیا جائے۔

۷۔ متوسطہ کو ابتدائیہ کے نہج پر آگے بڑھایا جائے اور اس کے لئے وسائل بہم پہونچائے جائیں۔

۸۔ علیا میں ایک جانب ایک ایک شعبہ کو لے کر مقتضیات زمانہ کے اعتبار سے تدوین کے عمل کا آغاز کیا جائے اور حکیمانہ ترتیب کے ساتھ ایک ایک شعبہ قائم کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی منصوبہ بندی ہو۔ آغاز اسلامیات، دینیات، دعوت اور شخصی ارتقاء وغیرہ سے کیا جاسکتا ہے، دوسری جانب فوری طور پر حکومتی نہج پر مروج ایک معیاری ڈگری کالج کے ذریعہ طلبہ کی فراہمی اور بعض مطلوبہ مضامین میں اختصاص کی سمت پیش رفت کا آغاز کر دیا جائے۔

۹۔ بعض ایسے شعبہ جات کا آغاز بھی ہو جن پر مصارف کم ہوں اور آمدنی بھی ممکن ہو۔ تربیت

اساتذہ کو اگر سرکاری اسکیموں سے مربوط کیا جاسکے تو ان مراکز سے دونوں فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح کاز کو تقویت پہنچانے اور وسائل کی فراہمی کے لئے خالص تجارتی نقطۂ نظر سے بعض کام شروع کیے جاسکتے ہیں۔

مسئلہ کی اہمیت متقاضی ہے کہ اہل علم اور اہل خیر حضرات پہلی فرصت میں علوم کے اس مرکزی نکتہ اور بنیاد کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں۔ پورے وثوق اور اطمینان کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ مروج معاصر عالمی تعلیمی نظام کی مضرت اور اس کے کھوکھلا پن کے باعث اسلامی تصور تعلیم انشاء اللہ اپنی معتبر جگہ بنانے میں بہت جلد کامیاب ہوگا۔

جس تدریج کے ساتھ انحاء عالم میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کا عمل جاری ہے، امید ہے اسلامی تصور تعلیم اپنا جائز مقام تسلیم کرالے گا مگر شرط یہ ہے کہ اس میدان کو مرکزی مقام دیا جائے اور کچھ باوقار افراد اور ادارے اپنی پوری توجہ اس جانب مبذول کردیں۔

خاص طور سے فرزندان جامعۃ الفلاح کو اسلامی تصور تعلیم کے کامیاب احیاء کا بیڑہ اٹھانا چاہئے کیوں کہ جامعہ بذات خود اسی سلسلہ کی ایک تجرباتی کڑی ہے۔ جامعہ سے روحانی تعلق کا اس سے زیادہ پائیدار اور بامعنی ثبوت کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ بلاشبہ یہ ہم پر جامعہ کا قرض ہے جسے چکانے کے لئے آگے آنا چاہئے۔

منصوبہ بندی اور اقدامات :

اللہ کا شکر ہے مادر علمی جامعۃ الفلاح کو نہ صرف اسلامی تصور تعلیم کے مطابق تعلیمی محاذ پر پیش رفت کی ضرورت کا احساس ہے بلکہ آگے بڑھ کر اس نے ایک اعلیٰ سطحی بااختیار کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو باریک بینی سے جائزہ لے کر بعض عملی تجاویز مرتب کرے جنہیں بعجلت ممکنہ زیر عمل لایا جاسکے۔ کمیٹی کے غور وفکر اور منصوبہ سازی کے لئے ذیل میں ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے، امید ہے ان شاء اللہ ان کوششوں سے آگے کی راہیں کھل سکیں گی۔

تجویز نمبر ۱۔ پہلا کام تو یہ کرنا چاہئے کہ معنوی اعتبار سے مکمل طور پر جامعہ کے نظریہ تعلیم سے مربوط مگر انتظامی اعتبار سے یک گونہ آزاد ایک سوسائٹی یا ٹرسٹ قائم کیا جائے۔ اس تجویز کی بنیادی طور پر دو وجوہات ہیں۔

اسباب: نمبر ا۔ مختلف اسباب کی بنا پر جامعۃ الفلاح سوسائٹی کے تحت اقدامات میں بڑی دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ حکومتی ادارے بعض تحفظات کے سبب جامعہ کے تعلق سے ایسا رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو بہر حال جامعہ کے مفاد میں نہیں ہے۔ جامعہ اپنے مقاصد کی جانب پیش قدمی

میں دستور ہند میں مذکور مراعات سے پوری طرح استفادہ نہیں کرپارہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ رکاوٹوں کو دور کرنے پر توجہ صرف کرنی چاہئے۔ بے شک اس جانب توجہ کے ساتھ ضروری ہے کہ بربنائے حکمت دوسرے ایسے راستے تلاش کرلئے جائیں جن کے توسط سے آگے بڑھنے میں آسانی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ رکاوٹوں کو دور کرنے میں قیمتی وقت ضائع ہوتا رہے۔

نمبر۲۔ جامعہ کو اپنے مقاصد کے حصول اور منصوبوں میں رنگ بھرنے کے لئے کسی مخصوص مقام تک محدود اور مقید نہیں ہونا چاہئے۔ مشیت یزدی اور وقتی حالات کے پس منظر میں اسلامی نظریہ تعلیم کی اساس قصبہ بلریا گنج میں ڈالی گئی لیکن چونکہ جامعہ ایک نظریاتی ادارہ ہے اور نظریات کسی مقام خاص تک محدود نہیں رہتے لہٰذا اس کے لئے زمینی پھیلاؤ ضروری ہے۔ جامعہ کے نظریہ تعلیم سے ہم آہنگ اداروں میں توسیع ہونی چاہئے۔ توسیع میں مناسب افرادی قوت اور دیگر مادی وسائل کی فراہمی کی بڑی بڑی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اسلامی نظریہ تعلیم کی توسیع عظیم کام ہے، صرف قصبہ بلریا گنج اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

محرکات و مقاصد:

اس تجویز کے بنیادی طور پر دو محرکات یا مقاصد ہیں۔

نمبر ا۔ اسلامی نظریہ تعلیم جو جامعۃ الفلاح کا کاز ہے اس کاز کو مستحکم کرنا اور اس کی توسیع وفروغ کے لئے حسب سہولت مختلف مقامات پر مزید شعبہ جات قائم کرنا۔

نمبر ۲۔ اس کاز کو معنوی اور مادی اعتبار سے قوت بہم پہنچانا، اس کے لئے عملی اقدامات کرنا اور ضروریات کی تکمیل کے لئے وسائل فراہم کرنا۔

تشریح:۔ معنوی تقویت Support سے مراد یہ ہے (الف) اسلامی نظریہ تعلیم کو مدلل کیا جائے، حسب حال درسیات اور لٹریچر تیار کیا جائے، اس نظریہ میں رنگ بھرنے والے منتظمہ، اساتذہ اور دیگر کارکن تیار کئے جائیں۔ (ب) مختلف شعبہ جات کے لئے منصوبہ سازی کی جائے اور ایک ترتیب کے ساتھ نمونے کے ادارے قائم کئے جائیں۔

مادی تقویت Support سے مراد یہ ہے اس فکری اساس پر منصوبہ سازی اور عملی اقدامات میں خطیر رقم اور مختلف انسانی وسائل کی ضرورت ہوگی، ان ضروریات کی تکمیل کے لئے ایسی کوششیں کی جائیں کہ بطور خاص مالی دشواریوں پر قابو پایا جاسکے، اسی کے ساتھ مختلف پروجیکٹس کی تیاری اور آگے بڑھانے کے لئے اضافی رقم Corpus Money مہیا کرائی جائے۔

دائرۂ کار: اس ٹرسٹ کا دائرۂ کار پورا ملک ہندوستان ہے لیکن پہلے مرحلہ میں بلریا گنج،

لکھنو، دہلی، علی گڑھ، اور ممبئی میں مقاصد کو بروئے کار لانے کی کوشش کی جائے گی۔

تجویز نمبر ۲: چند منصوبے

1 الفلاح ماڈل اسکول Alfalah Model School

ضرورت متقاضی ہے کہ جدید تقاضوں کے پیش نظر ایک معیاری ماڈل اسکول قائم کیا جائے۔ جامعۃ الفلاح اور دیگر مقامات پر پرائمری سطح کے مکاتب و مدارس قائم ہیں اور بلاشبہ ان کی اپنی جگہ ایک افادیت اور معنویت ہے لیکن ایسے معیاری اسکولس کی ضرورت بہرحال ہے جو اسلامی تصورِ تعلیم کے تحت اپنے بچوں کو تعلیم دلانے والے سرپرستوں کو دوسرے متاثر نظریات کے حامل اسکولوں سے بے نیاز کردیں۔ رکھ رکھاؤ، تعلیمی معیار، تربیت، نظم ونسق اور وسائل کے اعتبار سے جدید ترین ہوں۔ یہ ماڈل اسکولس جامعۃ الفلاح اور دوسرے مناسب مقامات پر قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ان اسکولوں کو بتدریج انٹرمیڈیٹ سطح تک لے جایا جائے۔

2 . الفلاح اکیڈمی اینڈ ریسرچ سنٹر

Alfalah Academy & Research Center

جامعۃ الفلاح اسلامی نظریۂ تعلیم کی علامت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نظریہ کے فروغ اور عملی اقدامات میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہورہی ہے۔ ابتدائیہ، متوسط اور علیا ہر سطح پر مناسب حال درسیات کی ضرورت ہے۔ جدید علوم کو اسلامی نظریۂ تعلیم کے قالب میں ڈھالنے کے لئے کافی محنت اور ریسرچ ورک کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی تعلیم وتعلم کے محاذ پر تعلیم کے اسلامی نقطۂ نظر کو معقولیت اور ٹھوس دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے لہٰذا منصوبہ بندی، درسیات کی تیاری، کتابوں کا انتخاب، نشان دہی، فراہمی، تالیف وتصنیف وغیرہ کے لئے مستقل ریسرچ اکیڈمی کی ضرورت ہے جو اس محاذ پر کام کرنے والوں کو فکری ونظریاتی غذا فراہم کرتی رہے۔

3 . الفلاح ٹیچرس ٹریننگ کالج

Alfalah Teachers Training College

سارے وسائل مہیا ہوں لیکن اگر اس نقشے میں رنگ بھرنے والے اساتذہ وکارکنان نہ فراہم ہوں تو مطلوبہ نتیجہ نہیں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اساتذہ کی فنی تربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔ اترپردیش اور پورے ملک میں ایسے چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے موجود ہیں جنہیں اسلامی نظریۂ تعلیم کے مطابق اساتذہ کی ضرورت ہے۔ یہ ادارے تنخواہیں بھی مناسب فراہم کرسکتے ہیں۔ تربیت اساتذہ کی کئی اسکیمیں حکومت کی نگرانی میں چلائی جاتی ہیں مگر فن تدریس کے ساتھ اسلامی

نظریۂ تدریس اور طلبہ کی فکری وعملی تربیت پر توجہ اس مجوزہ کالج کا امتیاز ہوگا۔ اپنے اس امتیاز کو قائم رکھتے ہوئے اگر حکومتی اسکیموں کے تحت B.T.C. or B.Ed کالج قائم کئے جاسکیں تو ایک طرف مناسب اساتذہ فراہم ہوں گے اور ساتھ ہی مالی وسائل بھی میسر آئیں گے، اس کے عملی انطباق پر تفصیلی غور وفکر کی ضرورت ہے۔

4 . الفلاح ڈگری کالج Alfalah Degree College

جامعۃ الفلاح اور دیگر مدارس کے فارغین کی اکثریت مزید تعلیم کے لئے موجود کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رخ کرتی ہے اور وہاں تعلیم کے پورے مصارف خود برداشت کرتی ہے۔ اس رجحان میں خلا یہ ہے کہ ان طلبہ کو مدارس سے فراغت کے بعد ایک بالکل نئے اور نامانوس ماحول سے سابقہ پیش آتا ہے۔ اس ماحول کا دباؤ ان کی اکثریت برداشت نہیں کرپاتی اور کم وبیش وہی رنگ اختیار کرلیتی ہے جو ان اداروں کا ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، دوسری حقیقت یہ ہے کہ یہ طلبہ عام طور پر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے لئے انہیں مضامین کا انتخاب کرتے ہیں جن سے وہ مدرسہ کی تعلیم کے دوران متعارف یا مانوس ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کے پس منظر میں اسلامی نظریۂ تعلیم کی ضرورت یہ ہے کہ طلبہ مروج مضامین میں اختصاص حاصل کریں۔ خصوصی توجہ اور رہنمائی سے اس مرحلہ تعلیم کے ذریعہ مطلوبہ مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

الفلاح ڈگری کالج کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ پوری طرح عصری درسگاہوں کے مانند حکومتی ضوابط کے تحت مجوزہ ڈگری کالج قائم کیا جائے۔ مضامین کے انتخاب بھی آزادانہ ہوں۔ البتہ کالج کا عملہ کوشش کرے کہ ہونہار طلبان مضامین پر خصوصی توجہ دیں جن میں اختصاص کی اہل اسلام کو ضرورت ہے اور اضافی توجہ ونگرانی سے ہر فن کے ماہرین تیار کئے جائیں۔ اس کالج کا ہدف مخصوص مضامین میں ماہرین کی تیاری ہے لیکن اس کے لئے الگ نہج پر ادارہ قائم کرنے کے بجائے موجودہ تعلیمی دھارے سے ہم آہنگ رہ کر اگر کوشش کی جائے تو بی اے اور ایم اے کرنے والے طلبہ کی بڑی تعداد میسر ہوگی، مالی بوجھ بھی زیادہ نہیں برداشت کرنا ہوگا اور مطلوبہ مقاصد بھی حاصل کئے جاسکیں گے۔

☆☆☆

حیاتِ نو کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیجئے۔
خود بھی ممبر بنئے اور دوسروں کو بھی ممبر بنایئے۔

شاہ ولی اللہ کے نظریہ ارتفاقات کی معنویت

علماء عصر جدید کی تحریروں کا مطالعہ

ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
استاذ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز
اے ایم یو، علی گڑھ

انیسویں اور بیسویں صدی کے برصغیری علماء اور دانش وران میں جن اصحاب علم وکمال نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فلسفہ ارتفاقات کو معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کی اصلاح کا اہم عنصر قرار دیا ہے، ان میں معروف ہستیاں یہ ہیں:

مولانا عبید اللہؒ سندھی (م ۱۹۴۴ء)، مولانا سید سلیمانؒ ندوی (م ۱۹۵۳ء)، مولانا حفظ الرحمٰنؒ سیوہاروی (م ۱۹۶۲م)، مولانا سید محمد میاںؒ (۱۹۷۵ء)، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (م ۱۹۷۹ء)، مولانا منظور نعمانیؒ (۱۹۹۷ء)، مولانا سید ابوالنظر رضویؒ امروہوی، ڈاکٹر مرزا امجد علی بیگ، پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی اور ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی وغیرہ۔ ان حضرات نے اردو اور انگریزی تحریروں میں شاہ ولی اللہ کی اقتصادی بصیرت کو خراج عقیدت پیش کی ہے۔ معاشیات و اخلاقیات کا باہمی ربط و ناگزیریت پر عالمانہ روشنی ڈالی ہے اور اس ربط وتعامل کے ثمرات کو حضرت شاہ کی معاشی فکر کا مرکزی عنوان قرار دیا ہے۔

نظریہ ارتفاقات کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ اس اصطلاح کے موجد ہیں۔ سیاسیات، سماجیات اور معاشیات کے مختلف گوشوں پر جامع بحثیں آپ نے حجۃ اللہ البالغہ، البدور البازغہ اور التفہیمات الالٰہیہ میں کی ہیں۔ ان موضوعات کو ارتفاقات کا جامع عنوان آپ نے عطا کیا ہے۔ اس موضوع پر علامہ ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء) کے بعد شاہ صاحب کی بحث سب سے زیادہ جامع، مدلل اور نادر نظر آتی ہے۔ حضرت شاہ کو مسلم فکر کا جو ورثہ ملا اس میں ابن ابی الربیع (نویں صدی) اور ابو نصر فارابی (م ۹۵۰ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات کی المقدمہ، السیاسۃ المدنیہ اور سلوک المالک فی تدبیر الممالک یقیناً معاہدۂ عمرانی کی تفہیم میں مددگار ثابت ہو چکی ہیں۔ دوسری طرف اٹھارہویں صدی میں مغرب میں سیاسی نشاۃ ثانیہ اور عوامی بیداری کے ہراول دستہ کے طور پر تھامس ہابس (Thomes Hobbes) (م ۱۶۷۹ء)، جان لاک (John Locke) (م ۱۷۰۴ء) اور روسو (Rosseau) (م ۱۷۷۸ء) وغیرہ نے فطری ریاست اور معاہدۂ عمرانی کے نظریات پیش کیے۔ حضرت شاہ کا عمرانی نظریہ ان حضرات کے نظریات کے مقابلہ میں زیادہ قابل عمل نظر آتا ہے[1]

علامہ ابن خلدون کی نگاہ میں انسان ایک سماجی فرد ہے (جس کے لیے انھوں نے مدنی بالطبع کے الفاظ استعمال کیے ہیں) اور وہ اپنی مخصوص سماجی اور اقتصادی ضروریات رکھتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی نگاہ میں ان ضروریات کی تلاش وجستجو اور تکمیل چار مراحل میں ہوئی۔ ان چار مراحل کو وہ ارتفاقات کا نام عطا کرتے ہیں۔ انگریزی زبان میں ارتفاقات کے لیے زیادہ قابل فہم الفاظ مترجمین نے استعمال کیے ہیں یعنی Four Stages of Socio-Economic Development[2]

حضرت شاہ نے 'ارتفاقات' کے ذریعہ انسانی زندگی کو خوش گوار، خوش بخت اور خوش نصیب بنانے کے لیے اس کے انفرادی واجتماعی اور دنیوی واخروی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس کو شریعت کے مطابق بنانے پر زور دیا ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بحث اولیت کا درجہ رکھتی ہے کیوں کہ بظاہر کسی اور نے اس تفصیل سے اس موضوع کو بیان نہیں کیا ہے۔ شاہ صاحب نے زندگی گزارنے کے لوازمات اور اقتصادیات ومعاشیات کا رشتہ دین واخلاق سے جوڑا ہے ان کا کہنا ہے کہ بغیر اس مضبوط و مستحکم رشتہ کے انسانی زندگی پر سکون، اطمینان بخش اور خوش گوار نہیں ہو سکتی۔[3]

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کی جلد اول میں چار مراحل ارتفاقات کا ذکر کیا ہے جس کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

ارتفاق اول:

افراد معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات، کھانا کپڑا اور مکان کو اپنے طبعی ملکات کی بنا پر پورا کرتے ہیں۔ غذا کی فراہمی کے لیے کاشت کاری، جنسی تسکین کے ذریعہ نسل کی بقا کا سامان کرتے ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش اور عقل مند وسادہ لوح افراد معاشرے کو مہذب بناتے ہیں۔

ارتفاق دوم:

ارتفاق اول کے مسائل ومعاملات کو صحیح تجربات کی صورت میں ڈھالا جاتا ہے تاکہ نفع کی شرح

زیادہ اور نقصان کی کم سے کم ہو اجتماعیت اور تہذیب انسانی کے آداب و معیارات قائم کیے جاتے ہیں۔ حرام و حلال، خراب و صحیح، نفاست و شرافت، طہارت و جسمانی نظافت کا شعور جنم لیتا ہے۔ مرد و زن، زوجین، اولاد و والدین، آقا و غلام، ملکیت و ملوکیت کے آداب برتے جاتے ہیں۔ تدبیر منزل سے جب شہری تمدن کی منزل آتی ہے تو ارتفاق سوم کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

ارتفاق سوم:

یہ سیاست مدن کا عہد و مرحلہ ہوتا ہے جب مختلف شہروں کے باشندے باہمی تعلقات کی رعایت کرتے ہیں اور یہ قومی ملکی منزل یا اجتماعیت کا عہد ہوتا ہے۔

ارتفاق چہارم:

انسانی معاشرہ بین الاقوامی تعلقات اور نافع و سود مند روابط کے دور میں داخل ہوتا ہے اور وہ عالمی نظام اور آفاقی تمدن کی منزل ہے۔ [۲]

فلسفہ ارتفاقات کے اس اجمالی تعارف کے بعد آئندہ صفحات میں عصر جدید کے فضلاء و باحثین کی وہ منتخب تحریریں پیش کی جاتی ہیں، جنھوں نے اس فلسفہ کو نادر، معیاری، اور قابل عمل قرار دیا اور ارتفاقات کے اقتصادی پہلو کو اجاگر کیا ہے بایں ہمہ بعضوں نے سیاسی و سماجی احوال کا بھی ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں اقتصادی عدم توازن کو تمدنی زندگی کی تباہی اور بدحالی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے اور معاشرے کی اقتصادی اصلاح کو مذہبی و روحانی ترقی کی بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ [۵]

پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی نے اپنے انگریزی مقالے میں غالباً اسی قضیے کو حل کیا ہے اور چھ معاشی نکات حوالے کے طور پر پیش کیے ہیں جو عہد مغلیہ کے زوال کا راست باعث بنیں۔ انھوں نے اپنے مقالے میں کتب شاہ کا حوالہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ چھ نکات حسب ذیل ہیں:

۱- شاہی بیت المال کی مفلسی و محتاجی (Indigence of the Imperial treasury)

۲- خالصہ زمینوں کی ٹھیکیداری کے ذریعہ کمیابی (Contraction of Khalsa Land)

۳- جاگیروں کی کثرت اور زیادتی (Increasing number of Jagirs (Fiefs)

۴- فوج اور حکومتی کارندوں کی تنخواہوں میں بے ضابطگی (Irregularity in payment to army and government officials)

۵- ٹیکسوں کی زیادتی اور پیداوار میں کمی (Heavy barden of taxation and decline in production)

۶- رئیسانہ انداز زندگی (Luxurious living) [۲]

(۱) عصر جدید کے مفکر و دانش ور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شاہ ولی اللہ کو امت اسلام کے مجددین کی فہرست میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ ان کے تجدیدی کارناموں کو گلہائے عقیدت پیش کیا ہے اور اسلام کے مکمل نظام حیات کی فکر پیش کرنے والوں میں انھیں اول مقام عطا کیا ہے، شاہ صاحب کے نظام اخلاق کی معنویت و اثر پذیری کو آپ نے قیمتی علمی ورثہ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> "نظام اخلاق پر وہ (شاہ ولی اللہ) ایک اجتماعی فلسفہ (Social Philosophy) کی عمارت اٹھاتے ہیں جس کے لیے انھوں نے 'ارتفاقات' کا عنوان تجویز کیا ہے اور اس سلسلہ میں تدبیر منزل، آداب معاشرت، سیاست مدن، عدالت، ضرب محاصل (Taxation)، انتظام ملکی اور تنظیم عسکری وغیرہ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں جن سے تمدن میں فساد پیدا ہوتا ہے۔"

(۲) شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کے اقتصادی بحران کو جیسا کہ گزر چکا، ملک کی بربادی، تباہی اور بدحالی کا سب سے بڑا سبب قرار دیا۔ مولانا سید محمد میاں، صاحب علماء ہند کا شاندار ماضی نے اس سبب کو مزید وسعت دیتے ہوئے یوں اظہار خیال کیا ہے:

> اس مذہبی رہنما (شاہ ولی اللہ) کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ عالم انسانیت میں ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سر بفلک قلعوں کو مسمار کر دیا ہے۔ اس لیے سوسائٹی کی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لیے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ [۵]

(۳) مولانا عبید اللہ سندھی نے جو واقف اسرار فلسفہ شاہ ولی اللہ بھی ہیں، اقتصادیات سے انسانی اخلاقیات اور روحانیت کے باہمی تعلق پر سیر حاصل کلام کیا ہے فرماتے ہیں:

عام طور پر تصوف اور فلسفہ اخلاق سے شروع کیا جاتا ہے، اقتصادی ضروریات، حیوانی زندگی کے لیے بے شک ضروری مانی جاتی ہیں، لیکن ان کا انسانیت سے سیدھا تعلق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس نے ہماری سیاست کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ ہمارے بڑے عقل مند اور زیادہ با اخلاق سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ مگر شاہ صاحب اس اصول کو حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مواقع پر نہایت وضاحت سے سمجھاتے ہیں...... اجتماعی اقتصادی نظام کی اصلاح کبھی انبیاء کے ذریعہ سے صورت پذیر ہوتی ہے اور کبھی صدیق اور حکیم کے واسطے سے۔ اقتصادی نظام کی درستی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی اجتماعیت کے اخلاق مکمل اور اخلاق کی تکمیل ہی قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات دلائے گی۔[9]

(۴) علامہ سید سلیمان ندویؒ کے رشحاتِ قلم کی جولانی نے شاہ ولی اللہ دہلوی کے اقتصادی و سیاسی روش و پرواز کو اردو کے متین کا قالب عطا کر دیا۔ باب "سیاسۃ المدنیۃ" کے ایک طویل اقتباس کے ذریعہ اسلامی ہندوستان کے زوال کے دو اسباب کو علامہ ندوی نے اقتصادی عدم توازن کا راست نتیجہ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"ان کی دور بین نگاہ سیاسیات و اقتصادیات کے جن باریک گوشوں تک پہنچ گئی تھی ابنائے عصر ان کے سمجھنے سے بھی قاصر تھے۔ جاگیرداری سسٹم نے تمام ملک کو امراء پر بانٹ دیا تھا، مرکزی کمزوری نے ان سب کی باگیں ڈھیلی کر دی تھیں، پشتینی امراء اس دعوے پر کہ ان کے بزرگوں نے کبھی اس سلطنت کا کوئی کارنامہ کبھی انجام دیا تھا بے درد سر اور بغیر کسی محنت کے سلطنت کی دولت اور زمین پر قابض تھے اور اب گو وہ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ سلطنت کا کوئی کام انجام دے سکیں پھر بھی اسی ظاہری طمطراق، تزک و احتشام، عیش و آرام اور نمائش کی زندگی بسر کر رہے تھے اور سلطنت کی مالیات کا نظام ان کی اس فضول عیاشی اور اسراف سے تہہ و بالا ہو رہا تھا...... اس غیر عادلانہ نظام کا نتیجہ تھا کہ بادشاہوں کو چونکہ بہر حال اپنے کاروبار کو چلانا تھا اس لیے سرکشوں اور زبردستوں کو جن سے وہ کچھ نہیں لے سکتے تھے چھوڑ کر غریب کسانوں پر اور ان پر جو ان کی فرمائشوں کی تعمیل سے سرتابی نہیں کر سکتے تھے کل سلطنت کے مصارف کا بار تھا اور سارے محصول اکیلے ان ہی سے وصول کیے جا رہے تھے جن سے ملک کی بے چینی اور بدحالی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان غیر متوازن اقتصادی حالات کا انجام تباہی کے سوا کیا تھا۔[10]

(۵) مولانا منظور نعمانی، مدیر الفرقان نے حضرت شاہ قدس سرہٗ اور ان کے کام کا مختصر

تعارف انتہائی مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر میں "شاہ صاحب بحیثیت ماہر اقتصادیات و معاشیات" کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر ماہرین اقتصادیات و معاشیات کی کوئی تاریخ لکھی جائے تو اس میں بھی شاہ صاحب کا تذکرہ نہایت نمایاں طور پر ہوگا۔ صرف حجۃ اللہ البالغہ اور بدور البازغہ میں ابواب "ارتفاقات" کے ذیل میں انھوں نے اقتصادی و معاشی مسائل پر جو کلام کیا ہے اور جو اصول اس سلسلہ میں مرتب کیے ہیں اگر کوئی حکومت نیک دلی اور دیانت داری کے ساتھ ان کو اپنا "دستور اساسی" قرار دے لے تو یقیناً انشاء اللہ اس کی قلمرو میں وہ ہمہ گیر بے چینی اور طبقاتی کش مکش پیدا نہ ہوگی جو اقتصادی اور معاشی الجھنوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور فی زمانہ جس نے قریباً ہر ملک کے باشندوں سے چین و اطمینان اور زندگی کا سکون چھین لیا ہے اور بنی نوع آدم کی غالب اکثریت کے حق میں جیتے جی اس دنیا کو دوزخ بنا دیا ہے"۔[11]

(۶) مولانا سید ابوالنظر رضوی امروہوی نے حضرت شاہ ولی اللہ کی علمی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:

شاہ صاحب تمام اسلامی طبقات کی اصلاح و تنظیم اور ان کی صنعتی ترقیات کو بھی نہایت اہم چیزوں میں سے شمار کرتے ہیں بلکہ ان کے مکاشفات کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس انقلابی دور کے لیے صنعت و مزدور پیشگی ہی کو ملاء اعلیٰ کی مرضیات بتاتے ہیں یعنی ہمارے زمانہ میں خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے محنت پیشہ طبقات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس زمانہ کے لیے خدا اور اس کے مرکزی قانون کا منشا یہی ہے"۔[12]

(۷) ڈاکٹر مرزا امجد علی بیگ، سابق استاذ شعبۂ اقتصادیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے طویل مقالے میں حجۃ اللہ البالغہ کی بحث بابت 'ابتغائے رزق اور ارتفاقات' کو اسلامی اقتصادی نظام کی ماہیت کے افہام و تفہیم کے لیے مستند تصنیف و تفسیر قرار دیا ہے۔ موصوف گرامی، مغربی علم اقتصادیات کے مفاسد کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

مارکس نے صنعتی انقلاب کے ایک سو سال بعد اور آج سے کوئی ایک صدی پہلے سرمایہ داری کے مذموم رجحانات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک دوسرا فلسفہ حیات اور نیا نظام پیش کیا لیکن آدم اسمتھ کی کتاب "دولت اقوام" (مطبوعہ ۱۷۷۶ء) اور مارکس کی کتاب سرمایہ (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) کی اشاعت سے کہیں پہلے امام الہند ولی اللہ اپنی تصانیف

میں اقتصادیات کے ان اصولوں کی نشان دہی فرما چکے تھے جن کی بنیاد عدل پر قائم ہے...... اگر دیانت داری سے ان اصولوں کو مشعل راہ بنایا گیا ہوتا تو سرمایہ و محنت کا باہمی نزاع اور امیر و غریب اور بورژوا اور پرولتاری طبقوں کے مابین کشاکش بحرانی شکل اختیار نہ کرتی بلکہ اسلام کے وضع کردہ اصول اقتصاد یعنی عدل کی بنا پر سرمایہ و محنت میں توازن قائم ہوتا اور کائنات انسانی کی عام فلاح و بہبود کا ایک عالم گیر نظام قائم ہو چکا ہوتا...... اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام کے اقتصادی یا معاشی نظام پر جو تصانیف موجود ہیں ان میں بیش تر شاہ صاحب کی تعلیمات کو بطور سند پیش کیا گیا ہے۔[۱۳]

(۸) عصر جدید کے بالغ نظر محقق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط اپنے مقالے میں شرح و بسط کے ساتھ واضح کیا ہے۔ آپ نے اپنی اس کوشش کو علمی دنیا کی پہلی کوشش قرار دیا ہے۔ مولانا سیوہاروی نے جدید و قدیم فلاسفہ کے افکار کا مقارنہ پیش کیا ہے اور علم الاخلاق کو تمام علوم کے لیے لازمی قرار دیتے ہوئے علم المعیشت کے لیے اس کی ضرورت کو شاہ صاحب کے افکار کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> دوسری کتابوں میں جب آپ علم الاخلاق کے ان مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں علم الاخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماء اخلاق اور حکماء و فلاسفہ کو اس پر متفق پائیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں علم مابعد الطبیعہ (میٹافزکس)، فلسفہ طبیعی، علم الارتقاء، علم النفس، علم المنطق، فلسفۂ قانون، علم الاجتماع اور فلسفہ تاریخ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں کرتے کہ علم الاخلاق کا کوئی تعلق اجتماعی علم المعیشت سے بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس طرح کا ہے؟

ارسطو کی کتاب 'الاخلاق'، ابن مسکویہ کی کتاب السعادۃ اور تہذیب الاخلاق، ماوردی کی ادب الدنیا والدین، غزالی کی احیاء العلوم، راغب کی الذریعہ، ابن قیم کی مدارج السالکین اور اسی قسم کی دوسری اخلاقی کتابوں میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ مشہور حکماء و فلاسفہ اور علماء اخلاق کے تمام مباحث اخلاق کو غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے باوجود اس سلسلہ میں ناکامی کے سوائے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا چنانچہ قدیم علماء و حکماء مثلاً ارسطو، افلاطون، سقراط، منکہ ہندی، رواقی، ابیقورمین، کندی، فارابی، ابن سینا، غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، ابن ہیثم، ابن عربی، ابن مسکویہ اور اخوان الصفا کے بیان کردہ "اخلاقی نظریے" جس طرح اس مسئلے میں تہی دامن ہیں اسی طرح جدید علماء اخلاق مثلاً کانٹ، اسپنسر شوپنہار، ڈیکارٹ فرانسوی، ہیوم، اسٹورٹ مل، سپنوزا اور ہیگل کے حکمت و

فلسفہ کے تمام اخلاقی نظریے بھی اس سوال کے جواب میں درماندہ و بے چارہ نظر آتے ہیں۔ حالانکہ جرمن فلاسفہ آگسٹ کومٹ اور کانٹ اور انگریز فلاسفہ ہربرٹ اسپنسر تو ان مشاہیر فلاسفروں میں سے ہیں جنھوں نے علم الاخلاق کے ساتھ علم الاجتماع اور علم الارتقاء کو منطبق کرنے کے لیے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پرواز خیال اس رفعت و بلندی تک نہ پہنچ سکی جو ولی اللہ دہلوی کے حصہ میں آئی۔

متاخرین علماء اخلاق عارف جامی، سعدی اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا مگر دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی پر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہے اور ہوتی رہی ہے یعنی اجتماعی اقتصادیات، اس کا نشان یہاں بھی نہیں ملتا...... امام الحکمہ ولی اللہ کے علاوہ تمام علماء اخلاق جدید ہوں کہ قدیم یہ سمجھتے رہے کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو حسین بنانے کے لیے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے اس لیے انھوں نے جدید علم الاخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی ہے مگر ان تمام علماء سے جدا ولی اللہ نے یہ دعویٰ کیا کہ 'اجتماعی اخلاق' کا حسن اس وقت تک نہیں نکھر سکتا جب تک کہ اقوام کے اجتماعی جسم کو فاسد معاشی نظام کے جذام سے صحت نہ ہو جائے۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسم اقوام میں دوڑنے لگے گا اور اس کے حسن و زیبائش کے لیے کسی خارجی پوڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔[۱۴]

(۹) عصر جدید کے معروف ماہر اقتصادیات عبدالعظیم اصلاحی: پروفیسر اسلامک اکنامکس ریسرچ سنٹر، کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ نے فلسفہ ارتفاقات کو بیسویں صدی کے متعدد معاشی و اقتصادی نظریات کا حامل و جامع قرار دیا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں:

> His Concept of Irtifaqat is so Comprehensive that it Can accommodate Various ideas of growth models presented in the twentieth century.[۱۵]

> ترجمہ: حضرت شاہ کا تصور ارتفاقات بیسویں صدی کے ان پہلوؤں کا جامع ہے جو معاشیات کی افزودگی کے لیے اختیار کیے جا رہے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے باجبروت عالمی نظام حکومت کے لیے معاشیات کو کلیدی عہدہ نہیں سونپا ہے غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمگیریت (Internationalism) کا تصور ان کے زمانے میں ابھرا ہوا نہیں تھا تاہم شاہ صاحب کے خلافت الخلفاء (Overlord) کے تصور میں عالمی تنظیموں کے لیے مدلل علمی و عملی مواد ہے تاکہ سیاسی و معاشی اعتبار سے جو قومیں اور ریاستیں پچھڑ گئی ہیں ان کی مدد کی جا سکے اور ظلم و

چیرہ دستیوں سے ان کی حفاظت کی جا سکے۔

موصوف گرامی نتیجہ بحث پیش کرتے ہیں کہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے جن معاشی تصورات وافکار کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر کا ذکر جن قدماء کی کتب میں ملتا ہے وہ یہ ہیں: ابو یوسف، الغزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن خلدون وغیرہ۔ شاہ صاحب نے متعدد معاشی نکات کو ارتفاقات کی بحث میں تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کا ذکر قدماء کی کتب میں ملتا ہے مثلاً محنت ومزدوری کا اختصاص اور تقسیم، مزدوری کے تبادلے کی ضرورت وحاجت، بازار کی ترقی، مبادلہ (Barter System) کی دشواریاں، دولت کی ماہیت اور اس کا عمل، سود کی ممانعت کی علتیں، تقسیم زکوٰۃ کا انتظام وانصرام، عوامی فلاح وبہبود، البتہ حضرت شاہ ولی اللہ کا اس ضمن میں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مذکورہ معاشی اعمال وسرگرمیوں کو وہ مختلف ادوار میں تقسیم کر دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے ان کا رشتہ وتعلق استوار کرتے ہیں اور قریہ سے لے کر قومی وبین الاقوامی سطح پر معاشی ارتقاء کے مدارج کو عادلانہ معاشی نظام کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ اسی تفصیل کو وہ ارتفاقات کا نام دیتے ہیں۔[۱۶]

(۱۰) ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، استاد شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فلسفہ ارتفاقات کے عمرانی وسیاسی پہلو کا ناقدانہ جائزہ مغربی مفکرین مثلاً تھامس ہابس، جان لاک اور روسو وغیرہ کے حوالے سے پیش کیا ہے نیز مسلم فلاسفہ مثلاً ابو نصر فارابی اور ابن خلدون کے نظریہ ارتقاء واجتماع سے بحث کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ کے 'ملت قصوی' کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ فاضل محقق کی نگاہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ کامل معاشرہ محض آورش معلوم ہوتا ہے جس کا وجود میں آنا ممکن نہیں تو بہت مشکل ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر شاہ ولی اللہ نے تین رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے:

(الف) اس معاشرہ کے قیام کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو مافوق البشر صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک ہوں اور ایسے مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں خالق ومخلوق کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ جاتا ہے۔

(ب) ایک ایسے مفکر کی ضرورت ہے جو انسانی نفسیات کے جملہ علوم پر عبور رکھتا ہو تاکہ وہ معاشرہ کے افکار ونظریات اور روایات ورسوم کے حسن وقبح کے بارے میں حتمی رائے دے سکے۔

(ج) معاشرہ کے تمام افراد کم از کم اتنی صلاحیت کے مالک ہوں کہ وہ علماء ومصلحین کے اقوال پر نہ صرف یہ کہ عمل کر سکیں بلکہ ان کے مقصد اصلی اور ان کے اسرار ورموز تک رسائی حاصل کر سکیں۔[۱۷]

یہ تینوں خصوصیات ایسی ہیں جن کا وجود محالات میں سے ہے اسی لیے ہم اسے مثالی معاشرہ تو قرار دے سکتے ہیں مگر اس کے قیام کی ضمانت نہیں فراہم کر سکتے۔ شاہ ولی اللہ کے نظریہ ملت قصوی کا تقابل فارابی کی المدینۃ الفاضلہ اور افلاطون کی Ideal State سے کیا جا سکتا ہے...... شاہ ولی اللہ کی ملت قصوی کا نظریہ زیادہ ناقابل حصول ہے مگر ساتھ ہی زیادہ عوامی اور جمہوری ہے۔ افلاطون دانش ور بادشاہ میں اور فارابی رئیس اول میں تمام صفات واختیارات کی ترکیز کے خواہش مند ہیں مگر شاہ ولی اللہ تمام افراد معاشرہ کے اندر ان صفات کو جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں رائے عامہ کی تفہیم وترسیل اور تشکیل وترتیب پر زیادہ زور ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ افلاطون کا دانش ور بادشاہ زیادہ فلسفیانہ اور خیالی صفات رکھتا ہے۔ فارابی نے اس نظریہ پر تنقید کی ہے اور اسے مافوق البشر معیار قرار دیا ہے اور اپنے 'رئیس اول' کو کسی قدر حقیقی دنیا سے قریب بتایا۔ خلاصہ یہ کہ شاہ ولی اللہ کی ملت قصوی ان سب سے زیادہ عملی، حقیقت سے زیادہ قریب تر اور موجودات سے زیادہ ہم آہنگ ہے اگرچہ اب بھی وہ ناقابل حصول ہے۔[۱۸]

مذکورہ حضرات کے علاوہ چند اور باحثین نے بھی شاہ ولی اللہ کے فلسفۂ ارتفاقات پر بحث کی ہے اور معاشی نکتوں کی وضاحت کی ہے۔ ذیل کا مختصر انڈکس محققین کے لیے مفید ہوگا۔

۱- حبیب سبحانی، شاہ ولی اللہ اور ان کا اقتصادی پروگرام، ماہنامہ الولی، حیدرآباد وسندھ، ۵:۱ (اگست ۱۹۷۲ء)، ۶۹-۹۳

۲- محمد امین ایم اے، شاہ ولی اللہ کے معاشی افکار، الولی، حیدرآباد وسندھ، ۳:۵-۶ (اگست۔ ستمبر ۱۹۷۴ء)، ۳۳-۴۰

۳- ریاض صدیقی، شاہ ولی اللہ کے معاشی افکار، رسالہ سابق، ص ۹۴-۱۰۰

۴- جاوید محمد خالد، مختلف پیشوں کی اہمیت اور ان کی مناسب تقسیم شاہ ولی اللہ کی نظر میں، المعارف، لاہور، خصوصی شمارہ، نمبر ۷، (جولائی ۱۹۸۷ء) ۵۱-۶۳

۵- طفیل احمد قریشی، شاہ ولی اللہ کی نظر میں مسلمانوں کے معاشی مسائل کا حل، فکر ونظر، اسلام آباد، ۷:۳ (ستمبر ۱۹۶۹ء) ۲۱۸-۲۲۶

۶- صدیقی عبد الواحد، شاہ ولی اللہ کا تصور دولت، الرحیم، ۶:۱ (جون ۱۹۶۸ء) ۶۹-۷۴

۷- مولانا الٰہی بخش جار اللہ ایم اے، شاہ ولی اللہ کے معاشی ارتقاء کے فلسفہ پر ایک تقابلی وتعارفی نوٹ، الرحیم، ۶:۱ (جون ۱۹۶۸ء) ۲۹-۴۴

خاتمہ بحث:

نظریہ ارتفاقات کی ولی اللہی بحث کو عصر جدید کے مصنفین کی تحریروں میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کسی قدر ہوگئی تاہم کثیر الجہاتی ارتفاقات اب بھی تشنہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ضرب محاصل اور تنظیم عسکری کے علاوہ دیگر پہلوؤں کو بھی اردو تحریروں میں تلاش کیا جائے۔

فلسفہ ارتفاقات کا نکتۂ اصلی حضرت شاہ کے مطابق یہ ہے کہ عالمی معاشی نظام کی منصفانہ ضابطہ بندی پر ایمان کی سلامتی، اعلائے کلمۃ اللہ کی ادائیگی اور اقامت دین کی پوری عمارت کا انحصار ہے۔ اس کا حل منصفانہ حصول دولت اور عادلانہ تقسیم ہے۔ آخری بات یہ کہ شاہ ولی اللہ تصور واحسان کے وہ پارکھ ہیں جو ایک طرف نفوس کے تزکیے کے لیے چلہ کشی اور زہد کی تلقین کرتے ہیں وہیں دوسری طرف جائز طریقوں سے حصول دولت کی کوشش اور اس کی عادلانہ تقسیم پر مدلل اور نادر فلسفہ ارتفاقات کو عصر جدید کی بے شمار ناہمواریوں کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہ کلید قرار دیتے ہیں۔

☆☆☆

حواشی و تعلیقات:

ا۔ قدیم وجدید مفکرین سیاسیات کے افکار اور حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریہ ارتفاقات کا تجزیہ ڈاکٹر عبید اللہ فہد نے تفصیل سے کیا ہے دیکھیے ان کا مقالہ بعنوان: شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی افکار، حجۃ اللہ البالغہ، ایک تجزیاتی مطالعہ (سیمینار کے مقالات کا مجموعہ، مرتب پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی)، ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۲۱۷

۲۔ Abdul Azim Islahi, Shah Wali Allah's Concept of Al-Irtifaqat (Stages of Socio Economic Development). Journal of Objective Studies, New Delhi, 1990- 2/1 P.60

۳۔ محمد اجتبا ندوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کا نظریہ ارتفاقات، حجۃ اللہ البالغہ ایک تجزیاتی مطالعہ، حوالہ سابق، ص ۲۳۳

۴۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، تحقیق السید سابق، دار الکتب الحدیثیہ، قاہرہ الجزء الاول، غیر مورخہ، ص ۸۳، ۸۷، ۹۰-۹۱، ۹۲، نیز دیکھیے پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی شخصیت و حکمت کا ایک تعارف، شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

ص ۳۹-۴۰

۵۔ حجۃ اللہ البالغہ، حوالہ سابق

۶۔ پروفیسر عبد العظیم، حوالہ سابق، ص ۶۱

۷۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، منصب تجدید کی حقیقت اور تاریخ تجدید میں حضرت شاہ ولی اللہ کا مقام، الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر، مرتبہ محمد منظور نعمانی، طبع ثانی، بریلی، ۱۳۶۰ھ، ص ۱۰۴-۱۰۵

۸۔ مولانا سید محمد میاں، علماء ہند کا شاندار ماضی، بدون تاریخ، جلد دوم، ص ۱۰

۹۔ مولانا عبید اللہ سندھی، امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف، الفرقان، حوالہ سابق، ص ۳۳۵

۱۰۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب، شاہ صاحب کی نظر میں، الفرقان، حوالہ سابق، ص ۳۵۰

۱۱۔ منظور نعمانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، الفرقان، حوالہ سابق، ص ۴۱۵

۱۲۔ مولانا سید ابو النظر رضوی امروہوی، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کی بعض علمی خصوصیات، الفرقان، حوالہ سابق، ص ۳۸۰

۱۳۔ ڈاکٹر مرزا امجد بیگ، شاہ صاحب کی تعلیمات کے اقتصادی پہلو، ماہنامہ الرحیم، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، جون ۱۹۶۸ء

۱۴۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، علم الاخلاق اور علم المعیشت کا باہمی ربط، الفرقان، حوالہ سابق، ص ۳۲۸-۳۲۹

۱۵۔ Jaurnal of objective Studies, opcit, P.61

۱۶۔ پروفیسر عبد العظیم اصلاحی، حوالہ سابق، ص ۶۰

۱۷۔ حجۃ اللہ البالغہ، الجزء الثانی، حوالہ سابق، ص ۳۵۷

۱۸۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی، شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی افکار، حوالہ سابق، ص ۲۲۵-۲۲۶

☆☆☆

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

علم فرض کفایہ عصر حاضر کے تناظر میں

مسعود عالم فلاحی
اسسٹنٹ پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
لکھنؤ کیمپس

اسلام میں تعلیم کی اہمیت:

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیا ہے۔ قرآنی تعلیمات اور احادیث نبویہ اس بات پر شاہد ہیں کہ علم کے بغیر انسان صحیح معرفت الٰہی نہیں حاصل کر سکتا۔ قرآن مجید کی پہلی جو آیات نازل ہوئیں وہ علم سے متعلق ہیں اور ان میں علم کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور قلم کی اہمیت بھی بتائی گئی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ. ﴾[العلق: ۱-۵]

''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''

قرآن مجید کی شروع میں نازل ہونے والی مکی سورتوں میں سورہ ''القلم'' بھی ہے۔ اس میں اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ. ﴾[القلم: ۱]

''ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔''

اس میں اللہ نے قلم کی قسم کھائی ہے اس کی قسم اس کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے کیوں کہ اللہ کسی چیز کی قسم صرف اس کی اہمیت اور قیمت بتانے کے لئے کھاتا ہے۔ سورہ ''زمر'' جو مکی ہے، اس میں اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ. ﴾[الزمر: ۹]

''ان سے پوچھو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہو سکتے ہیں؟''

اس آیت میں عالم اور جاہل کے درمیان فرق بتایا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ علم کا مضمون کیا ہے۔ مطلب یہ کہ جس طرح بینا اور نابینا، روشنی اور تاریکی، سایہ اور دھوپ، زندگی اور موت، انسانیت اور حیوانیت، جنت اور دوزخ برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح علم والے اور غیر علم والے بھی برابر نہیں ہو سکتے۔

سورہ ''فاطر'' مکی سورہ کے اندر ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ:

﴿ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. ﴾[فاطر: ۲۸]

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے ہی اس سے ڈرتے ہیں۔''

یہاں صیغۂ حصر ''انما'' آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں اس سے ڈرنے والے صرف علماء یعنی علم والے ہیں، جن کو اس کی معرفت حاصل ہے وہ اس کی ایسی قدر کرتے ہیں جیسا کہ کرنے کا حق ہے۔

مدنی سورہ ''آل عمران'' میں اللہ کا ارشاد ہے:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ. لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ. ﴾[آل عمران: ۱۸]

''اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور (یہی شہادت) فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی دی۔''

امام غزالیؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''فانظر کیف بدأ سبحانه تعالی بنفسه، و ثنی بالملائکة، و ثلث باهل العلم. و ناهیک بهذا شرفاً و فضلاً و جلاءً و نبلاً.'' (۱)

''دیکھو! سبحانہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے آپ سے شروع کیا، پھر فرشتوں کو اور پھر تیسرے اہل علم کو شامل کیا اور یہ ان کے شرف و فضیلت اور عظمت کی بنیاد پر کیا۔''

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے آدمؑ کو علم عطا کیا اور اسی علم کے سبب اسے زمین پر خلیفہ بنایا اور فرشتوں پر جو اللہ کی عبادت میں ہر وقت مشغول رہتے ہیں اسے فضیلت بخشی، اور فرشتوں اور جنات کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ (سورہ بقرہ ۳۰ تا ۳۴)

قرآن کریم میں علم سے متعلق بہت سی تعلیمات موجود ہیں، جنہیں طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ (۲)

شریعتِ اسلامی کے دوسرے مصدر حدیث شریف میں بھی علم پر کافی زور دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''طلب العلم فريضة على كل مسلم۔'' (۳) ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان [مرد و عورت] پر فرض ہے۔''

آپ نے فرمایا:'' من سلک طریقا یطلب فيه علما سهل الله له به طريقا الى الجنة۔'' (۴)

''جو حصولِ علم کے لئے نکلا، اس کے ذریعہ اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دے گا۔''

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''إن الملائكة لتضع أجنحتها لطالب العلم رضا بما يصنع.'' (۵)

'' طالبِ علم کے کام سے خوش ہو کر فرشتے اس کے لئے اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔''

پر بچھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل خشوع وخضوع کے ساتھ اس کی عزت وتوقیر کرتے ہیں۔

اسلام میں طلبِ علم کو جہاد فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ترمذی نے حضرت انسؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ:

'' من خرج في طلب العلم فهو في سبيل الله حتى يرجع. '' (۶) '' جو شخص حصولِ علم کے لئے نکلا وہ اللہ کی راہ میں [مجاہد کی طرح] ہے، جب تک کہ وہ لوٹ کر نہ آ جائے۔''

مسلمانوں کے درمیان یہ مقولہ مشہور ہے:'' اطلب العلم من المهد إلى اللحد. '' ''گود سے گور تک علم حاصل کر۔''

حتی کہ بعض لوگوں نے اسے حدیث نبوی سمجھ لیا ہے، حالانکہ یہ حدیث نہیں ہے۔ (۷)

علم کی اقسام:

اسلام کے اندر کچھ علم حاصل کرنا فرض ہے، تو کچھ مستحب، کچھ مباح ہے تو کچھ مذموم۔ اور جو علم حاصل کرنا فرض ہے اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) فرض عین، (۲) فرض کفایہ۔

جو علم حاصل کرنا فرض ہے اس کی حد بندی میں شارحین حدیث کے درمیان اختلاف ہے، ہر شخص اپنے لحاظ سے اس کا تعین کرتا ہے یعنی جو جس علم میں ماہر ہے، وہ اسی کو بتاتا ہے۔ چنانچہ متکلم کے نزدیک یہ علم، علم عقائد ہے، فقیہ کے نزدیک یہ علم فقہ ہے، مفسر کے نزدیک یہ علم، علم تفسیر ہے، تو محدث کے نزدیک یہ علم حدیث ہے، صوفی کے نزدیک یہ علم، علم طریقت ہے، تو ماہرین اصول فقہ کے نزدیک یہ علم اصول فقہ ہے، حتی کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ علم، علم نحو وصرف ہے، تو بعض کے نزدیک یہ علم

طب۔ (۸)

علامہ یوسف قرضاوی نے اس سلسلے میں ایک عنوان قائم کیا ہے'' رأينا في العلم المفروض على كل مسلم '' (ہر مسلمان کے لئے واجبی علم کے حصول کے متعلق ہماری رائے)، اور اس کے تحت لکھتے ہیں:

" و الذي أراه هنا: أن بعض هذه الأقوال خلطت بين العلم المفروض طلبه على كل مسلم و مسلمة، و هو ما يسمى "فرض عين" و بين العلم المفروض "فرض كفاية". فعلم التفسير و الحديث و أصول الفقه و علوم العربية، بل و علم الطب: لا بد منها، على مستوى الأمة، لا على مستوى الأفراد. فهي من فروض الكفاية بلا ريب. و فروض الكفاية هي: ما لا تستغني عنها الأمة من مجموعها، و لا بد أن يقوم بها عدد كاف من أبناء الأمة يسد الثغرة، و يلبي الحاجة، و إلا أثمت الأمة كلها." (۹)

'' ہماری نظر میں یہاں بعض اقوال، علوم فرض عین اور علومِ فرض کفایہ کے درمیان خلط ملط ہو گئے ہیں۔ جہاں تک علم تفسیر، علم حدیث، اصول فقہ، عربی زبان، بلکہ طب کا تعلق ہے، تو یہ امت پر بہ حیثیت مجموعی ضروری ہیں نہ کہ افراد پر۔ (چنانچہ یہ فرض کفایہ ہیں۔ اور فرضِ کفایہ یہ ہے کہ امت مجموعی طور پر اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ ضروری ہے کہ امت کے اندر اتنی بڑی تعداد موجود ہو جو اس کمی کو پورا کر سکے اور ضرورت کو پورا کر سکیں۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو پوری امت گنہ گار ہوگی۔''

سیاق میں وہ مزید فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ علم عقائد، ضرورت کے مطابق فقہی احکام، کچھ علم طریقت جو معرفت الٰہی کا سبب بنے، سیرت نبوی کا علم، اور لکھنے پڑھنے کا طریقہ وغیرہ سیکھے۔ (۱۰)

دوسرے الفاظ میں دینی امور سے متعلق اتنا کچھ سیکھ لے جس کے ذریعہ توحید، شرک اور حلال وحرام کی پہچان کر سکے۔

فرض کفایہ کی اقسام: فرض کفایہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) علوم دینیہ میں فرض کفایہ

(۲) اور علومِ دنیویہ میں فرض کفایہ

علوم دینیه میں فرض کفایه:

جہاں تک علم دین کے اندر گہرائی پیدا کرنے کا سوال ہے، تو وہ فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے، تاکہ امت میں ایسے لوگ موجود ہوں کہ جب ان سے فتویٰ پوچھا جائے تو علم کی روشنی میں فتویٰ صادر کریں اور جب کسی فیصلے کے لئے کہا جائے تو حق کے مطابق فیصلہ کریں، اور جب اسلام کی دعوت و تبلیغ کریں تو علم و حکمت سے کریں۔ اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ﴾ [التوبة: ۱۲۲]

”مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے، تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔“

اس آیت کے اندر تمام امت پر طلب علم کے لئے نکلنا واجب نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ہر فرقہ کی ایک جماعت پر کیا گیا ہے، چاہے وہ جماعت دو پر مشتمل ہو، یا اس سے زیادہ۔ لیکن اسی کے ساتھ امت مسلمہ کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اس امر سے پہلوتہی کرے، یہاں تک کہ کوئی بھی نہ ہو جو لوگوں کو علم دین سکھا اور بتا سکے۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث میں ہے:

”ان الله لا يقبض العلم انتزاعا، ينتزعه من العباد، و لكن يقبض العلم بقبض العلماء، حتى اذا لم يبق عالما، اتخذ الناس رؤوسا جهالا، فسئلوا، فافتوا بغير علم فضلوا و اضلوا.“ (۱۱)

” اللہ علم کو اس طرح ختم نہیں کرے گا کہ وہ لوگوں کے سینوں سے اسے کھینچ لے۔ بلکہ اسے علماء کو اٹھا کر ختم کرے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم نہیں بچے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے، وہ [ان سے] سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے، خود بھی گمراہ ہوں گے اور [دوسروں کو بھی] گمراہ کریں گے۔“

لہٰذا، امت پر واجب ہے کہ اس میں سے کچھ لوگ تیار ہوں جو دعوت دین اور افتاء وغیرہ کی خدمت انجام دے سکیں، اور ان کی تعداد اتنی ہو جو ہر شہر کی ضرورت کو پورا کر سکے۔

علوم دنیویه میں فرض کفایه:

جہاں تک دنیوی علوم میں فرض کفایہ کا تعلق ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی کی عبارت نقل کر دی جائے، وہ لکھتے ہیں کہ:

” اما فرض الكفاية منها: كل علم لا يستغنى عنه في قوام أمور الدنيا، كالطب اذ هو ضروري في حاجة بقاء الأبدان، كالحساب، فانه ضروري في المعاملات و قسمة الوصايا و المواريث وغيرهما، و هذه هي العلوم التي لو خلا البلد عمن أن يقوم بها حرج أهل البلد و اذا قام بها واحد كفى و سقط الفرض من الآخرين. و لا يتعجب من قولنا: ان الطب و الحساب من فروض الكفايات، فان أصول الصناعات أيضاً من فروض الكفايات، كالفلاحة و الحياكة و السياسة، بل الحجامة و الخياطة، فانه لو خلا البلد من الحجام تسارع الهلاك اليهم، و حرجوا بتعريضهم أنفسهم للهلاك، فان الذي أنزل الداء، أنزل الدواء، و أرشد الى استعماله، و أعد الأسباب لتعاطيه، فلا يجوز التعرض للهلاك باهماله. و أما ما يعد فضيلة لا فريضة، فالتعمق في دقائق الحساب، و حقائق الطب، و غير ذلك مما يستغنى عنه و لكنه يفيد زيادة قوة القدر المحتاج اليه.“ (۱۲)

”فرض کفایہ: وہ علم ہے جس کے بغیر دنیا کا انتظام نہیں چل سکتا، جیسے طب کہ وہ جسم کی بقاء کے لئے ضروری ہے، حساب کہ وہ معاملات، وصیتوں اور میراث کی تقسیم کے لئے ضروری ہے۔ یہ وہ علوم ہیں کہ اگر کوئی شہر ان کے جاننے والوں سے خالی ہو تو اہل شہر کو پریشانی لاحق ہوگی۔ اگر کوئی ایک بھی یہ علوم سیکھ لے تو ضرورت پوری ہو جائے گی اور دوسروں پر سے فرض ساقط ہو جائے گا۔ لہٰذا ہماری اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ علم طب اور حساب فرض کفایہ ہیں۔ اصول صنعت بھی فرض کفایہ میں داخل ہیں، جیسے زراعت، حیاکت [کپڑا بننا] سیاسہ [گھوڑے کو سدھانا]، بلکہ حجامت [پچھنا لگانا] اور خیاطی بھی۔

اگر کوئی شہر پچھنا لگانے والے سے خالی ہو جائے تو لوگوں کی ہلاکتیں بڑھ جائیں گی اور ان کی جانوں کے لئے خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ کیوں کہ جس نے بیماری پیدا کی اس نے دواء بھی پیدا کی ہے، نیز اس کے استعمال کا راستہ اور اس کے تناول کے وسائل وذرائع بتائے ہیں۔ لہٰذا، اس سے غفلت برت کر ہلاکت کے منہ میں جانا جائز نہیں۔ جو چیزیں فرض نہیں بلکہ فضیلت پر مبنی ہیں، جیسے دقائق حساب اور حقائق طب وغیرہ میں

گہرائی پیدا کرنا۔ یعنی جس سے بے نیاز تو ہوا جا سکتا ہے لیکن اس میں مہارت سے ضرورت مندوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔"

امام غزالیؒ کی یہ رائے مضبوط اور مقاصد شریعت کے عین مطابق ہے کیوں کہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ امت مسلمہ ایک مضبوط اور خود کفیل امت بنے، جو دشمنوں کے چیلنجز کا جواب دے سکے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ امت پر واجب ہے کہ وہ تمام علوم مثلاً سائنسی علوم، علم ریاضی (Mathematics) وغیرہ سیکھے جو آج کے دور میں آگے بڑھنے کا ذریعہ ہے، صرف طب اور حساب (Arithmetic) پر اکتفا نہ کرے، کیوں کہ انہوں (امام غزالیؒ) نے اپنے زمانے کے لحاظ سے بات کہی ہے۔

اسی طرح امت پر یہ فرض کفایہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ ترقی پذیر صنعتوں کو سیکھے تا کہ وہ اس میدان میں امامت کا درجہ حاصل کر لے۔ آج مغرب دنیا پر، اور بطور خاص دنیائے اسلام پر صرف اسی وجہ سے حکومت کر رہا ہے کہ اس نے، فزکس، نیوکلیر فزکس (Nuclear Physics)، فلکیات، کیمیا، علم حیات (Biology)، جیولوجی، وغیرہ جدید علوم پر عبور حاصل کر رکھا ہے اور انجینیرنگ، جومیٹری، آرکیٹکچر، علم جینیات، علم منافع اعضاء (Physiology)، اسلحہ اور ادویہ سازی کے میدان میں سب سے آگے ہے۔

مغرب اخلاق واقدار سے عاری ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے اسلحہ اور ادویہ سازی کا علم دنیا کے لئے خطرہ بنتا جا رہا ہے: جہاں ایک طرف ایٹمی، کیمیاوی اور جراثیمی اسلحہ سے دنیا کو خطرہ لاحق ہے، وہیں ادویہ سازی بھی غیر محفوظ ہے، اسے ایسے لوگ تیار کر رہے ہیں، جو نہ تو خالق سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی مخلوق پر رحم کرتے ہیں۔ اخبارات، ٹی وی، انٹرنیٹ کے ذریعہ نام نہاد بیماریوں کا پرچار کرتے ہیں تا کہ ان کی دوائیاں بازار میں فروخت ہوں۔ جیسا کہ Selling Sickness [سیلنگ سِکنیس] (۱۳) کے مصنفین جناب رے موئے نیہان (Ray Moynihan) اور جناب الن کاسیلس (Alan Cassels) نے بڑی تفصیل اور دلائل کے ساتھ اسے بیان کیا ہے۔

دوسری جانب عالم انسانیت کو علم جینیات (Genetic Engineering) اور جانوروں کی کلوننگ (Animal Cloning) پر حصول قدرت سے خطرہ لاحق ہے کہ کہیں یہ عالم انسانی کے اندر نہ داخل ہو جائے۔

اس سے اسی وقت حفاظت ہو سکتی ہے جب اہل ایمان اور اخلاق وکردار کے حامل لوگ اسے نشو ونما دیں، کیوں کہ اسلام میں یہ واجب ہے کہ علم انسانیت کے لئے فائدہ مند ہو، نقصان دہ نہ ہو،

اسی لئے رسول اکرم ﷺ علم غیر نافع سے پناہ مانگتے تھے۔

امام غزالیؒ کا یہ کہنا کہ دقائق حساب وحقائق طب میں گہرائی پیدا کرنا فضیلت ہے فریضہ نہیں، یہ ان کے زمانہ کے لحاظ سے تھا اور انہوں اپنے دور کے لحاظ سے بات کہی تھی، لیکن آج کے دور میں اس کے اور اس کے مانند دوسرے علوم جیسے علم ریاضی، فزکس، کیمسٹری، جیولوجی، علم الحیوان (Zoology)، علم بحار، علم صحراء وغیرہ فریضۂ لازمہ ہے۔ آج دوسری قومیں اس میں بہت دور نکل چکی ہیں۔ اگر یہ علوم نہ ہوتے تو موجودہ زمانہ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیکنالوجی، ٹیلی فون، موبائل، جہاز اور راکٹ وغیرہ بنانے میں کامیاب نہ ہوتا، اور نہ ہی چاند پر جا پاتا، اور نہ ستاروں پر جانے کی کوشش کرتا۔

امت میں چند لوگوں کے ان علوم میں ماہر ہو جانے سے فرض کفایہ کی ادائیگی نہیں ہوگی، بلکہ ضرورت ہے کہ ایک بڑی تعداد میں لوگ تیار ہوں جو ان تمام علوم میں دوسری قوموں سے آگے بڑھ جائیں۔

سائنسی اور ریاضیاتی علوم پر عبور :

آج کے دور میں علم صرف فکر نہیں بلکہ تجربہ کی بنیاد پر قائم ہے اور یہ تمام سائنسی اور ریاضیاتی علوم پر محیط ہے اور یہ مادی ترقی کی بنیاد ہے۔ قرآن وحدیث سے پتا چلتا ہے کہ انسان کو ہر اس علم سے مستفید ہونا چاہئے جسے اللہ نے اس کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِنْهُ﴾ [الجاثية: ۱۳]

"اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا۔"

اسلام تجربات کا احترام کرتا ہے اور دنیاوی امور میں اسے باقی رکھتا ہے۔ اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے باقی رکھا۔ جیسا کہ مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ نے انصار کو تابیر نخلہ کرتے (نر کھجور کے پھول کو مادہ کھجور کے پھول پر چھڑکتے) دیکھا، کیوں کہ ایسا کرنے سے پھل اچھے آتے ہیں۔ چونکہ آپ مکہ جیسے غیر زرعی اور پتھریلی سرزمین میں پیدا ہوئے تھے، اس لئے آپ کو اس کا تجربہ نہیں تھا۔ لہذا اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انصار نے آپ کی رائے کو وحی الٰہی سمجھ کر، تابیر نخلہ کو بند کر دیا۔ اس سال فصل اچھی نہیں ہوئی، جب رسول ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا، یہ صرف میری رائے تھی، دنیاوی امور میں تم زیادہ تجربہ کار ہو "انتم اعلم بامور دنیاکم" (۱۴)

بوقت ضرورت زبانوں کو سیکھنا :

پوری امت پر فرض کفایہ یہ بھی ہے کہ بوقت ضرورت وہ دوسری قوموں کی زبان اور خاص طور

سے وہ زبان جسے وہ نہیں جانتی ہے سیکھے، کیوں کہ جب وہ ان کی زبان سے غافل رہے گی تو وہ ان کے علم وحکمت سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اسلام نے دوسری قوموں کی زبان سیکھنے سے منع نہیں کیا ہے بلکہ یہ ان کے نزدیک دوسری قوموں کے ساتھ افہام وتفہیم کا ذریعہ اور دعوت اسلام پھیلانے کا وسیلہ ہے۔ تمام زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں، اللہ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ.﴾ [ابراهيم: ۴]

''ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے، اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے، تا کہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔''

رسول اکرمؐ اگر چہ عربی تھے، قرآن کی زبان عربی ہے، تا کہ قریش اسے اچھی طرح سمجھ سکیں، لیکن آپ کی دعوت عالمی تھی، اللہ کا ارشاد ہے:

﴿تَبَارَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا.﴾ الفرقان: ۱]

''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تا کہ سارے جہاں والوں کے لئے نذیر ہو۔''

﴿وَ مَا أَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۷]

اے محمدؐ! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے۔''

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا...﴾ [الأعراف: ۱۵۸]

''اے محمدؐ! کہو کہ ''اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں.....''

جب اسلام کی دعوت عالمی دعوت ہے تو ضروری ہے کہ ایسے لوگ موجود ہوں جو یہ دعوت دوسری قوموں تک ان کی زبان میں پہونچا سکیں۔ خود رسول اکرمؐ کے پاس ایسے صحابہ کرام موجود تھے جو فارسی، رومی، حبشی زبان جانتے تھے۔ یہود کی زبان سریانی جاننے والا کوئی نہیں تھا، تو رسول اکرم ﷺ نے انصاری صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کو اسے سیکھنے کا حکم دیا، اور صرف نصف ماہ کے اندر وہ اس زبان کے ماہر ہو گئے۔ (۱۵) لگتا ہے کہ انصار کا یہود کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے حضرت زید بن ثابتؓ کو اس زبان سے معمولی سی واقفیت پہلے سے تھی، اسی لئے وہ تھوڑی سی مدت میں اس کے ماہر ہو گئے تھے۔

علم الاحصاء/ اعداد و شمار کے علم (Statistics) پر عبور:

علم احصاء/اعداد وشمار اور اس سے متعلق تمام علوم جو زندگی کے مراحل میں کام آتے ہیں پر عبور حاصل کرنا بھی فرض کفایہ میں داخل ہے۔ کیوں کہ اس دور میں کسی بھی معاملہ کو سلجھانے اور اپنی بات کو

دوسروں کے سامنے مدلل طور پر صحیح ثابت کرنے کے لئے اس کا استعمال ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ علم خاص طور سے کٹ حجتی کرنے والوں کو خاموش کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

آپؐ نے مدینہ میں اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں ہی اس سے فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ بخاری اور مسلم شریف میں حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ: ''ہم لوگ رسولؐ کے ساتھ تھے تو آپؐ نے فرمایا: ''احصوا لی کم یلفظ الاسلام؟'' مجھے گن کر بتاؤ کہ کتنے لوگ اسلام کو ماننے والے ہیں۔''

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ: آپؐ نے کہا:

''اکتبوا لی من تلفظ بالاسلام من الناس؟ مجھے تحریری شکل میں بتاؤ کہ کتنے لوگ اسلام کے ماننے والے ہیں۔'' حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ:

''فکتبنا له الفا و خمس ماۃ رجل'' (۱۶) ''پس ہم نے ایک ہزار پانچ سو آدمی کا نام لکھ کر بتایا۔''

اسلامی ریاست کے شروع میں علم احصاء/اعداد وشمار کا استعمال اس بات پر دلیل ہے کہ اسلام میں علمی وسائل کے استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ اعداد وشمار تحریری تھی، جس کی آپ تدوین چاہتے تھے، تا کہ مسلمانوں کی قوت کا آپ کو اندازہ ہو، جس کے ذریعہ آپؐ دشمنوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اسی لئے صرف مردوں یعنی جنگ پر قدرت رکھنے والوں ہی کی گنتی ہوئی۔

مستقبل کی منصوبہ بندی (planing) کا علم:

دور حاضر میں مستقبل کی منصوبہ بندی کا علم حاصل کرنا بھی فرض کفایہ میں شامل ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ مستقبل کی جھلکیاں محسوس کی جاتی ہیں۔ اس علم کا انحصار قوم وملک کی موجودہ ظاہری، باطنی طاقت، اس کے پڑوسیوں سے تعلقات اور علمی تحقیق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ علم ظنی اور تخمینی ہے، قطعی اور یقینی نہیں۔

مسلمانوں کے لئے یہ جائز ہی نہیں ہے کہ وہ اس علم سے غافل رہیں، جبکہ دوسری قومیں اس سے مکمل فائدہ اٹھا رہی ہیں، اپنے بڑے بڑے مدبرین اور تنظیموں کو اس کام پر لگا رکھا ہے، باضابطہ ہر ملک کے پاس اپنے اپنے پلاننگ کمیشن موجود ہیں۔

اسے مطلق علم غیب (جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے) حاصل کرنے کی کوشش پر محمول نہ کیا جائے، جہاں تک بات غیب نسبی (الغیوب النسبیة) کا تعلق ہے، جسے اللہ نے سنن الٰہی کے حدود میں رہتے ہوئے، بندوں کو مختلف وسائل کے استعمال کے ذریعہ معلوم کرنے کا راستہ بتایا ہے، وہ غیر شرعی نہیں

ہے، بلکہ جائز ہے۔ یہ Meteorological observation (علم الأرصاد الجوية) کے مانند ہے، جو حرارت، گرمی، سردی، اور بارش وغیرہ کی خبریں فضاء میں تبدیلی کی بنیاد پر دیتا ہے، اور اس کی بنیاد پر ماحولیات میں تبدیلی کی امید کی جاتی ہے۔

جب علم احصاء/اعداد و شمار علمی طریقہ کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے تو مستقبل کی منصوبہ بندی بھی اسی طرح ہے، بلکہ وہ تو سب سے بڑی علمی علامت ہے، کیوں کہ مستقبل کی منصوبہ بندی کا انحصار علم احصاء/اعداد و شمار پر ہوتی ہے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی کا مقصد ایک لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو مستقبل کے خطرات کا مقابلہ کر سکے اور متعینہ اہداف کو پورا کر سکے۔

کچھ لوگ مستقبل کی منصوبہ بندی کو دین کے خلاف سمجھتے ہیں، در اصل یہ سوچ پرانی فکر کے اثر کا نتیجہ ہے، جب علم کو ایمان کے بالمقابل کھڑا کر دیا گیا تھا، کہ یہ دونوں دو مختلف چیزیں ہیں جو کبھی اکٹھا نہیں ہو سکتیں۔ اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو جوہر دین مستقبل کی منصوبہ بندی پر قائم ہے، کیوں کہ دیندار آدمی اپنے آج سے کل کے لئے زاد راہ اکٹھا کرتا ہے، یعنی زندگی سے موت کے لئے، دنیا سے آخرت کے لئے، صحت سے مرض کے لئے، تا کہ اصل مقصود یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

مستقبل کی منصوبہ بندی کا ثبوت حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بھی ملتا ہے، جسے اللہ نے قرآن میں ذکر کیا ہے کہ بادشاہ وقت نے خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور اسی طرح سات ہری اور سات سوکھی دانے کی بالیاں دیکھیں۔ حضرت یوسف نے اللہ کے عطا کئے ہوئے علم کے مطابق بتایا کہ سات سال خوشحالی رہے گی اور اس کے بعد سات سال قحط سالی کا زمانہ رہے گا، پھر رفاہ کا زمانہ آ جائے گا۔ اس قحط سالی سے نمٹنے کے لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے ۱۵ سال کے لئے زرعی منصوبہ بندی کی۔ (سورہ یوسف ۴۳ تا ۴۹)

بعض لوگ مستقبل کی منصوبہ بندی کو توکل علی اللہ اور قضا و قدر پر ایمان کے منافی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے اس سے بھاگتے ہیں چہ جائیکہ وہ اس پر لوگوں کو ابھاریں۔ حالانکہ اگر گہرائی سے اسلام کا مطالعہ کریں تو یہ توکل علی اللہ کے خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں توکل یہ نہیں ہے کہ ان ظاہری اسباب اور سنن سے غفلت برتا جائے جن پر اللہ نے اس نظام کو قائم کر رکھا ہے۔ ہمیں اس اعرابی کا واقعہ یاد رکھنا چاہئے جو آپؐ کے پاس آیا اور اپنی اونٹنی مسجد کے باہر چھوڑ دی، اور رسولؐ خدا سے کہا: اے اللہ کے رسولؐ! کیا میں اپنی اونٹنی کو باندھ دوں پھر توکل کروں، یا چھوڑ دوں اور پھر توکل کروں؟ آپؐ نے فرمایا: " اعقلها و توکل. " (۱۷) اسے باندھ دو، پھر توکل کرو۔

امام طبریؒ ان لوگوں کا رد کرتے ہیں جو اسباب کو ترک کرنے کو توکل کا اعلیٰ مقام تصور کرتے ہیں،

وہ لکھتے ہیں کہ:

" الحق من وثق بالله، و أيقن أن قضاءه عليه ماض، لم يقدح في توكله تعاطيه الأسباب، اتباعاً لسنته و سنة رسوله، فقد ظهر -صلى الله عليه وسلم- بين درعين و لبس على رأسه المغفر، و أقعد الرماة على فم الشعب، و خندق على حول المدينة، و أذن في الهجرة الى الحبشة، و الى المدينة، و هاجر هو، و تعاطى اسباب الأكل و الشرب، و ادخر لأهله قوتهم، و لم ينتظر أن ينزل عليه من السماء، و هو كان أحق الخلق أن يحصل له ذلك. " (۱۸)

'' حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول کی سنت کی اتباع کرتے ہوئے، اپنے توکل کے اندر اسباب و وسائل کو اختیار کرنے میں کوئی تامل نہ کرے۔ نبیؐ جب (غزوہ کے لئے) نکلے تو زرہیں پہنیں اور سر پر خود پہنا، تیر اندازوں کو گھاٹی کے منہ پر بٹھایا، مدینہ کے ارد گرد خندق کھدوائی، حبشہ اور مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، بلکہ خود بھی ہجرت کی۔ کھانے پینے کے اسباب کو اپنایا، اپنے گھر والوں کے لئے زاد [Food stuff] ذخیرہ کیا، اور یہ انتظار نہیں کیا کہ آسمان سے ان پر یہ [چیز] نازل ہوگی، حالانکہ وہ مخلوق میں سب سے زیادہ اس بات کے حق دار تھے کہ ان کے لئے یہ [چیز آسمان سے] نازل ہو۔"

رسول اکرمؐ کی سیرت پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اللہ پر سب سے زیادہ توکل کرنے والے تھے، لیکن ساتھ ہی ہر کام منصوبہ بند طریقے سے کرتے تھے اور ممکن حد تک اسباب و وسائل اختیار کرتے تھے۔ چنانچہ جب قریش نے مسلمانوں کی ایذا رسانی میں حد کر دی، تو آپؐ نے انہیں حبشہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ حکم آنا فانا نہیں دیا تھا، اس وقت حبشہ کے جغرافیائی، سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے دیا تھا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نظام مواصلات کی عدم موجودگی کے باوجود رسولؐ اور آپ کے صحابہؓ دنیا کے حالات سے ناواقف نہیں تھے۔ اس کا مزید ثبوت اس وقت کی دو بڑی عظیم عالمی طاقتوں روم اور فارس کے درمیان جنگ کے تعلق سے مسلمان اور کفار قریش کے موقف میں ملتا ہے۔ رومیوں کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمان ان کی فتح کے خواہش مند تھے، تو اہل فارس کے کافر ہونے کی

وجہ سے کفارِ قریش ان کی فتح کے خواہش مند تھے۔ سورۂ "روم" کی ابتداء میں اس کا یوں ذکر ہے:

﴿الٓمٓ. غُلِبَتِ الرُّوْمُ. فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ. فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ. بِنَصْرِ اللّٰهِ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ﴾ [الروم]

"ا۔ل۔م۔رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں، اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہوجائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے، اللہ نصرت عطا فرماتا ہے جسے چاہتا ہے، اور وہ زبردست اور رحیم ہے۔"

یہ واقعہ اسلام کے ابتدائی دور کا ہے، جب مسلمان کمزور اور مظلوم تھے۔ اس کے باوجود وہ عالمی حالات پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان جاری جنگ پر ان کی نگاہ تھی، کہ کس کی جیت ہوتی ہے اور حالات کیسے بدلیں گے، یا اپنی جگہ برقرار رہیں گے، پھر ان حالات کا ان پر کیا اثر پڑے گا؟

مستقبل کی منصوبہ بندی کا ثبوت رسول اکرمؐ کی ہجرت کے واقعہ میں بھی ملتا ہے۔ اس کے اندر منصوبہ بندی اور توکل علی اللہ پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ آپ نے ہجرت سے قبل اس کے لئے تمام احتیاطی تدابیر کیں جو اس وقت ضروری تھیں۔ اوس و خزرج سے بیعتِ عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کیا، ان سے اپنی جان و مال کی حفاظت کی شرط رکھی، کہ وہ ان کی ایسی ہی حفاظت کریں گے جیسی وہ اپنی اور اپنے آل و اولاد کی کرتے ہیں۔ پھر مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا۔

اپنے سفر کے ساتھی کے لئے حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب کیا، اور قریش کو چکمہ دینے کے لئے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا دیا۔ ایک امانت دار غیر مسلم راستہ بتانے والے شخص عبداللہ بن اریقط کو تیار کیا۔ (اس واقعہ سے فقہاء یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب کسی غیر مسلم پر بھروسہ ہو تو اس سے غیر اسلامی فن سیکھا جاسکتا ہے۔) سواریوں کا انتظام کیا تا کہ وہ، ان کے رفیق اور عبداللہ بن اریقط سوار ہو کر مدینہ جا سکیں، پھر ایک جگہ کا انتخاب کیا، جہاں وہ لوگ سوار ہوں۔ کچھ دن چھپنے کے لئے ایک خفیہ مقام کا انتخاب کیا تا کہ قریش کی شدت تلاش کم ہوجائے اور وہ لوگ ان کی تلاش سے مایوس ہوجائیں۔ وہ جگہ غارِ ثور تھی، جو مدینہ کے راستہ پر نہیں بلکہ اس کی مخالف سمت پر تھی، تا کہ اس طرح قریش دھوکے میں رہیں۔

اس کے بعد حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کو اس کام پر لگایا کہ وہ کھانا اور

اہل مکہ کی خبریں غارِ ثور تک لایا کریں، پھر حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامر بن فہیرہؓ کو اس کام پر متعین کیا کہ وہ غارِ ثور تک بکریاں لایا کریں تا کہ وہ لوگ دودھ حاصل کرسکیں، ساتھ ہی ساتھ ان کو اس کام پر بھی لگایا کہ وہ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کے قدموں کے نشانات کو مٹادیا کریں تا کہ کسی کو کسی طرح کا شک نہ ہو۔

آپؐ نے منصوبہ بندی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، اور ہر مجاہد (یعنی شخص) نے اپنا اپنا رول ادا کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کا رول حضرت علیؓ سے مختلف تھا، حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کا رول حضرت عامر بن فہیرہؓ سے الگ تھا، اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ صحیح کام کر رہا تھا۔

ان تمام تدابیر کے باوجود قریش غارِ ثور کے منہ تک پہونچ گئے اور قریب تھا کہ راز فاش ہوجائے اور تمام تدابیر اور منصوبوں پر پانی پھر جائے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس وقت بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ اگر مشرکین میں سے کوئی اپنے پیر کے نیچے دیکھ لے تو وہ ہم لوگوں کو دیکھ لے گا۔ اس وقت اللہ کے رسول کی زبان مبارک سے توکل علی اللہ سے بھرا ہوا مومنانہ جملہ نکلا "وما ظنک یا ابا بکر باثنین، اللہ ثالثھما" (۱۹) قرآن نے اس واقعہ کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [التوبة: ۴۰]

"تم نے اگر نبی کی مدد نہ کی تو کچھ پرواہ نہیں، اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا، جب وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ "غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے" اس وقت اللہ نے اس پر اپنی طرف سے سکونِ قلب نازل کیا اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہیں آتے تھے اور کافروں کا بول نیچا کردیا۔ اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے، اللہ زبردست اور دانا وبینا ہے۔"

دراصل یہی توکل علی اللہ کا صحیح مفہوم ہے کہ مومن اپنی استطاعت کے مطابق تمام تدابیر کرلے، پھر اللہ پر بھروسہ کرے اور کہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ [التوبة: ۴۰] اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

ماہرین فن سے علم سیکھنا:

مسلمانوں پر یہ بھی فرضِ کفایہ ہے کہ ہر نفع بخش علم کو سیکھے، وہ علم چاہے غیر مسلم کے پاس ہی کیوں

نہ ہو۔ خود آپؐ نے بدر کے مشرکین قیدیوں کے علم سے فائدہ اٹھایا اور ان کی رہائی کی یہ شرط رکھی کہ وہ لوگ مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھادیں۔ انصاری صحابی حضرت زید بن ثابتؓ نے ان سے ہی علم حاصل کیا تھا، جو بعد میں کاتب وحی اور حضرت ابوبکرؓ کے دور خلافت میں مرتب قرآن بنے۔

امام ترمذی، امام ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ ایک حدیث روایت کی ہے کہ:

"كلمة الحكمة ضالّة المؤمن، أنى وجدها فهو أحق بها"(۲۰)

"حکمت بھری بات مؤمن کا گمشدہ سرمایہ ہے، جہاں اسے یہ ملے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔"

اگرچہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن معنی کے لحاظ سے قوی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

"العلم ضالّة المؤمن، فخذوه و لو من أيد المشركين."(۲۱)

علم مؤمن کا گمشدہ سرمایہ ہے، اسے حاصل کرو، اگرچہ مشرکین کے ہاتھوں ہی کیوں نہ حاصل کرنا پڑے۔"

اس سے مراد مادی علوم ہیں، اسی وجہ سے مسلمانوں نے ہر دور میں دوسری قوموں کے مادی علوم سے فائدہ اٹھایا، چنانچہ انہوں نے یونان، فارس، روم، ہندوستان اور بطور خاص یونان سے طب، کیمیا، علم الافلاک، ریاضی وغیرہ کا علم حاصل کیا۔

جہاں تک دوسری قوموں کے دینی افکار لینے کا سوال ہے، اسلام نے اس سے منع کیا ہے۔ امام احمدؒ نے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو یہودیوں کی دینی کتاب سے کچھ پڑھتے دیکھا، تو اپنی ناراضگی کا اظہار کیا، کیوں کہ اللہ نے قرآن کے ذریعہ تمام تحریف شدہ کتابوں سے مسلمانوں کو بے نیاز کردیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"أمتهوكون فيها يا ابن الخطاب؟ والذي نفسي بيده، لقد جئتكم بها بيضاء نقية، لا تسئلوهم عن شيء، فيخبروكم بحق فتكذبوا به، أو بباطل فتصدقوا به. والذي نفسي بيده لو أن موسىٰ عليه السلام كان حياً ما وسعه إلا أن يتبعني."(۲۲)

اے عمرؓ! کیا تم حیرت زدہ ہو؟ [یعنی اپنے عقیدے میں شک کے شکار ہو، یہاں تک کہ تم اپنی کتاب اور اپنے نبیؐ کے علاوہ کہیں اور سے علم لے رہے ہو۔] اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تمہارے پاس یہ صاف ستھری کتاب لے کر آیا ہوں، تم ان سے کچھ مت پوچھو، پس وہ تمہیں صحیح بات بتائیں گے اور تم اسے جھٹلاؤ گے، یا وہ تمہیں غلط بات بتائیں گے اور تم اسے سچ مان لو گے۔ اس ذات کی

قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو وہ میری اتباع کرتے۔

آپؐ نے اپنی ناراضگی کا اظہار اس لئے کیا تھا کہ یہ معاملہ عقیدہ سے متعلق تھا، اور عقیدہ صرف اور صرف صادق ومصدوق رسول اکرمؐ سے ہی لینا تھا، یہ اسلام کے ابتدائی ایام کا واقعہ ہے، لہذا آپؐ نے اس میں شدت برتی کہ ایسا نہ ہو کہ دین حق، دین باطل سے خلط ملط ہو جائے۔ اگر صرف معلومات کے لئے دوسرے مذاہب کی دینی کتابیں پڑھی جائیں تو یہ منع نہیں ہے، اس کے ذریعہ سے دعوت اسلام مزید بہتر طریقے سے دوسروں تک پہونچائی جاسکتی ہے۔

دوسری قوموں کے دنیاوی علوم سے رسولؐ نے خود بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسا کی اوپر آچکا ہے کہ بدر کے مشرک قیدیوں کی مدد سے آپؐ نے مسلم امت کی جہالت دور کرنے کی کوشش کی۔ اہل فارس کا طریقۂ جنگ اپناتے ہوئے مدینہ کے دفاع کے لئے خندق کھدوائی، اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ خندق پڑ گیا۔ طائف کے گھیراؤ کے وقت منجنیق کا استعمال کیا، ممبر پر خطبہ دیا، حالانکہ یہ ایک رومی بڑھئی کی صنعت تھی۔

خلفائے راشدین نے امت کی بھلائی کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسے علوم کو رائج کیا جنھیں عرب پہلے نہیں جانتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے سن ہجری، فن تاریخ اور فن دیوان کا ایجاد کیا۔ اسے مؤرخین اولیات عمرؓ میں شمار کرتے ہیں۔

بلکہ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ فن تدوین رسولؐ کے زمانہ میں ہی ایجاد ہو گیا تھا، وہ اس کی دلیل آپؐ کے ذریعہ علم احصاء، اعداد وشمار کے استعمال کو بناتے ہیں (۲۳)، جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔

لہذا وہ تمام علوم جن کی بنیاد پر غیر اسلامی ملک عام طور پر اور مغرب خاص طور پر آج ترقی یافتہ ہے، سیکھنا فرض کفایہ ہے۔ در حقیقت مغرب کے جدید علوم مسلمانوں کے علوم سے مستعار ہیں، وہ ان میں تہذیب وتدوین کر کے آج چاند تک پہونچ گئے اور مسلمان پیچھے رہ گئے۔ اگر ہم اسے سیکھتے ہیں تو یہ ہمارا کھویا ہوا سرمایہ ہے جو ہماری طرف لوٹ کر آجائے گا (ہذہ بضاعتنا ردت الینا)؛ کیوں کہ اسلام میں علم سنورتا ہے بگڑتا نہیں، باقی رہتا ہے مرتا نہیں۔ جس شخص کو یہ علم حاصل ہو وہ وہی کہے جو حضرت سلیمانؑ نے اس وقت کہا تھا جب ایک بڑے جن نے ملکۂ سبا کا تخت پلک جھپکتے ہی ان کے پاس حاضر کردیا تھا۔

﴿هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَ مَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾ [النمل: ۴۰]

"وہ پکار اٹھا" یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن

جاتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"

☆☆☆

نوٹ: اس مضمون کے اندر ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، بلکہ بعض افکار ان سے ہی ماخوذ ہیں، وہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) الرسول و العلم،مکتبہ وھبہ، القاھرہ،مصر،ط۔الثامنة،۱٤۲۷ھ/سنہ۲۰۰۶ء۔

(۲) العقل و العلم فی القرآن،مکتبہ وھبہ، القاھرہ، مصر، ط۔ الأولی، ۱٤۱٦ھ/۱۹۹٦ء، (۳) تیسیر الفقہ للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُّنّة (نحو فقہ میسر معاصر)،مکتبہ وھبہ، القاھرہ، مصر،ط۔الثانیة،۱٤۲٥ھ/سنہ۲۰۰٤ء۔

حواشی:

۱۔ الغزالی،حجة الاسلام ابو حامد: احیاء علوم الدین،المجلد الأول،کتاب العلم،الباب الأول فی فضل العلم و التعلیم و التعلم http://www.ghazali.org

تفصیلات کے لئے ڈاکٹر علامہ یوسف قرضاوی کی کتاب" العقل و العلم فی القرآن الکریم "حوالہ سابق دیکھی جائے۔

۳۔الحدیث روی عن عدد من الصحابة بأسناد ضعیفة۔ لکنہ الحافظ السیوطی صححہ بمجموع طرقہ التی بلغت خمسین طرقا، کما صححہ المحدث الالبانی فی تخریج أحادیث " مشکلة الفقر و کیف عالجھا الاسلام "للدکتور الشیخ یوسف عبد اللہ القرضاوی، و ذکر السخاوی أن ابن شاھین رواہ بسند رواتہ ثقات۔ و ھو فی صحیح الجامع الصغیر و زیادتہ (۳۹۱۳)،(۳۹۱٤)۔ بحوالہ القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد اللہ:تیسیر الفقہ للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُّنّة (نحو فقہ میسر معاصر).op.cit ص ۱۷۸۔

٤۔ الصحیح للبخاری، کتاب العلم،باب العلم قبل القول و العمل، http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

المستدرک علی الصحیحین، کتاب العلم،

http://english.islamweb.net/newlibrary/display_book.php

۵۔ رواہ الترمذی فی کتاب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادة،برقم (۲۸۹۸)

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

ھو جزء من حدیث أبی الدرداء الذی رواہ أحمد و أصحاب السنن و ابن حبان ، کما فی صحیح الجامع الصغیر (٦۲۹۷) بحوالہ القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد اللہ:تیسیر الفقہ للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُّنّة (نحو فقہ میسر معاصر).op.cit ص ۱۸۲۔

٦۔ رواہ الترمذی فی کتاب العلم، باب ما جاء فی فضل طلب العلم برقم (۲۸۵۹) و قال حسن غریب و رواہ بعضھم فلم یرفعہ۔

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp

قال فی فیض القدیر: فیہ خالد بن یزید اللؤلؤی قال العقیلی: لا یتابع علی کثیر من حدیثہ، ثم ذکر لہ الخبر۔ و قال الذھبی: واہ مقارب(٦/۱۲٤) و قال الحافظ فی " التقریب" صدوق یھم۔ بحوالہ القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد اللہ:تیسیر الفقہ للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُّنّة (نحو فقہ میسر معاصر)۔.op.cit ص ۱۸۲۔

۷۔ القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد اللہ:تیسیر الفقہ للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُّنّة۔.op.cit ص ۱۸۵۔

۸۔حوالہ سابق،ص۱۸۷-۱۸۸۔

۹۔حوالہ سابق،ص۱۸۸-۱۸۹۔

۱۰۔حوالہ سابق،ص۱۸۹-۱۹۷۔

۱۱۔ البخاری، محمد بن اسماعیل: الصحیح، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم،رقم الحدیث: ۱۰۰، و اللفظ لہ،

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

القشیری، مسلم بن حجاج :الصحیح، کتاب العلم، باب رفع العلم و قبضہ و ظھور الجھل و الفتن فی آخر الزمان، رقم الحدیث ، ٦۹۷۰،

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

۱۳۔الغزالی،حجة الاسلام أبو حامد: احیاء علوم الدین،المجلد الأول، کتاب العلم،الباب الثانی،فی فرض العین و فرض الکفایة من العلوم

http://www.ghazali.org/ihya/arabic/vol1-bk1.htm

١٣- Selling Sickness: How The World's Biggest Pharmaceutical Companies Are Turning Us All Into Patients,pub.Allen & Unwin South Asian edition:2008 .

١٣- الصحیح لمسلم کتاب الفضائل: ttp://hadith.al-islam.com

رواه الامام أحمد فی مسند طلحة، حدیث رقم ١٣٩٩، قال الشیخ شاکر: اسناده صحیح و قد جاء فی المسند مختصراً برقم ١٣٩٥، و رواه مسلم أیضاً برقم ٢٣٦١، ٢٣٦٢، ٢٣٦٣- بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة- (نحو فقه میسر معاصر) op.cit. ص ٢٠٢-

١٥- السنن لأبی داؤد، کتاب العلم

http://hadith.al-islam.com/Display/Display.asp

رواه البخاری و أبو داود، و الترمذی - انظر- جمع الفوائد و أعذب الموارد ط- المدینة المنورة، ٣١٩/١- بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة- (نحو فقه میسر معاصر) op.cit. ص ٢٠٣-

١٦- الصحیح للبخاری کتاب الجهاد و السیر، کتابة الامام للناس

http://hadith.al-islam.com/Display/Display.asp

انظر: جامع الأصول، تحقیق عبد القادر الأرناؤط، ١٠٠٠/١، بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة- (نحو فقه میسر معاصر) op.cit. ص ٢٠٤-

١٧- السنن للترمذی، کتاب صفة القیامة و الرقائق و الورع عن رسول الله ﷺ

http://hadith.al-islam.com/Display/Display.asp

رواه الترمذی من حدیث أنس، و قال: غریب أی ضعیف، و أنکره یحیی القطان، لکن أخرجه ابن حبان فی صحیحه من حدیث عمرو بن أمیة الضمری، و اسناده -کما قال الزرکشی:- صحیح -و رواه أیضاً ابن خزیمة فی صحیحه بلفظ: "قیدها و توکل" و اسناده - کما قال الزین العراقی: -جید- انظر فیض القدیر ج ــ ص

١٧ حدیث: ١١٩١- بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة (نحو فقه میسر معاصر)- op.cit. ص ٢٠٦-

١٨- نقله الامام الشوکانی فی نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار، الجزء التاسع ابواب الطب، باب

اباحة التداوی و ترکه

http://www.al-eman.com/ISLAMLIB/viewchp.asp

١٩- کتب سیرت۔

٢٠- السنن للترمذی، کتاب العلم باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، برقم الحدیث ٢٦٠٣

http://www.al-eman.com

امام قرضاوی کہتے ہیں "الحدیث ضعیف الاسناد، ولکن معناه صحیح-: القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة (نحو فقه میسر معاصر" ۔op.cit. ص ٢١٠-

٢١- جامع بیان العلم، ١٢١/١ بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة (نحو فقه میسر معاصر)- op.cit. ص ٢١٠-

٢٢- مسند أحمد، المجلد الثالث، تابع مسند جابر بن عبد الله رضی الله عنه، رقم الحدیث ١٤٦٢٣

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

تابع مسند جابر بن عبد الله رضی الله عنه، رقم الحدیث، ١٤٦٠٤،

http://www.al-eman.com/hadeeth/viewchp.asp

رواه أحمد کما فی "ترتیب المسند" للشیخ أحمد عبد الرحمن البنا - کتاب العلم رقم ٦٢ - و نقل فی تخریجه من صاحب "التنقیح" أن رجاله رجال الحسن، و هو عند أحمد، ابن ماجه عن ابن عباس -و اسناده حسن، و عن ابن حبان عن جابر أیضاً باسناد صحیح، و فی الباب عن عبد الله بن ثابت الأنصاری عند أحمد و ابن سعد و الحاکم فی "الکنی" و الطبرانی فی الکبیر و البیهقی فی شعب الایمان، و عن جابر عند الدارمی-

الفتح الربانی ١٧٥/١ بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة (نحو فقه میسر معاصر) op.cit. ص ٢١١-

٢٣- انظر "الترتیب الاداری" أو نظام الحکومة النبویة للکتانی، ٢٢٧/١-٢٢٨ بحواله القرضاوی، الدکتور الشیخ یوسف عبد الله: تیسیر الفقه للمسلم المعاصر فی ضوء القرآن و السُنّة- (نحو فقه میسر معاصر) ص ٢١١-

☆☆☆

الکوہل کا استعمال

ولی اللہ مجید قاسمی
شیخ الحدیث جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڑھ

الکوہل ایک کیمیائی مادہ ہے جو مختلف پھلوں اور اناج کے نشاستہ یا شکر سے بنایا جاتا ہے۔ اس کی بہت ساری قسمیں ہیں جس میں صرف ایک قسم اتھائل نشہ آور ہے۔ نشہ آور جامد چیزیں جیسے بھنگ، افیون اور حشیش وغیرہ تمام فقہاء کے یہاں پاک ہیں۔

نشہ آور مشروب اور سیال کو امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل، محمد بن حسن اور بعض دوسرے فقہاء ناپاک قرار دیتے ہیں (۱)۔ اس کے برخلاف امام مالک کے استاد ربیعہ، مشہور محدث اور فقیہ لیث بن سعد، امام شافعی کے مایہ ناز شاگرد علامہ مزنی اور امام داؤد ظاہری اسے پاک قرار دیتے ہیں۔ علامہ صنعانی، شوکانی اور قنوجی وغیرہ بھی اس کے قائل ہیں (۲)۔ امام ابوحنیفہ اور ابویوسف کے نزدیک انگور، کشمش اور کھجور کی شراب ناپاک ہے اور اس کے علاوہ دیگر چیزوں کی شراب پاک ہے، انگوری شراب نجاست غلیظہ ہے اور کشمش وغیرہ کی شراب نجاست خفیفہ ہے (۳)۔

شراب کی پاکی کے دلائل:

۱۔ ہر چیز میں اصل طہارت ہے، شریعت کا اصول یہ ہے کہ ہر چیز کو پاک سمجھا جائے گا مگر یہ کہ واضح اور صحیح دلیل سے کسی چیز کا ناپاک ہونا معلوم ہو جائے۔ کتاب و سنت میں شراب کی ناپاکی کے بارے میں کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے۔ اس لئے اصول اور ضابطے کے مطابق اسے پاک ہی سمجھا جائے گا (۴)۔

۲۔ کسی حرام چیز کے لئے ناپاک ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ حشیش حرام ہے لیکن ناپاک نہیں۔ البتہ نجاست کے لئے حرام ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا ہر نجس حرام ہے، لیکن ہر حرام نجس ہو ایسا ضروری نہیں۔ (۵)

۳۔ قرآن حکیم میں ”خمر“ کو ”رجس“ کہا گیا ہے اور ”رجس“ گندی اور گھناونی چیز کو کہا جاتا ہے،

اور گندی چیز کے لئے ناپاک ہونا ضروری نہیں ہے چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں:

لایظہر من الآیۃ دلالۃ ظاھرۃ لان الرجس عند اھل اللغۃ القذارۃ ولا یلزم من ذالک النجاسۃ وکذالک الامر بالاجتناب لایلزم منہ النجاسۃ۔

آیت سے بظاہر ناپاک ہونے کی وضاحت نہیں ہوتی ہے، اس لئے کہ اہل لغت کے نزدیک ”رجس“ گندگی کو کہا جاتا ہے جس کا ناپاک ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح سے اجتناب کے حکم سے بھی ناپاک ہونا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ (۶)

ناپاکی کے دلائل:

شراب کو ناپاک قرار دینے والوں کی سب سے اہم دلیل قرآن حکیم کی یہ آیت ہے:

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ (۷) شراب، جوا، بت اور پانسہ یہ سب گندے اور شیطانی کام ہیں، اس لئے ان سے بچو۔

اس آیت میں خمر کو ”رجس“ کہا گیا ہے اور یہ لغت کے اعتبار سے نجاست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (۸) اور قرآن و حدیث میں متعدد مواقع پر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر ”خنزیر“ کو نجس قرار دیا گیا ہے، اور جو لوگ شراب کی پاکی کے قائل ہیں وہ بھی خنزیر کے سلسلہ میں اسی لفظ کو نجاست کے مفہوم میں مراد لیتے ہیں (۹) اسی طرح سے حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس طہارت حاصل کرنے کے لئے پتھر کے ساتھ مینگنی لائی گئی تو آپ نے اسے پھینک دیا اور فرمایا ”ھی رجس“ یہ ناپاک ہے۔ (۱۰)

البتہ مذکورہ آیت میں خمر کے ساتھ جوا، پانسہ اور بت کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ یہ چیزیں ناپاک نہیں ہیں تو شراب کو بھی ناپاک نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ ہر ایک کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سلسلے میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ”رجس“ صرف ”الخمر“ کی خبر ہے اور بقیہ کی خبر محذوف ہے (۱۱) لیکن یہ ایک کمزور تاویل ہے، صحیح یہی ہے کہ رجس تمام چیزوں کی خبر ہے، اور چونکہ یہ مصدر ہے اس لئے اسے متعدد چیزوں کی خبر بنا سکتے ہیں، جیسے کہ ایک آیت میں کہا گیا ہے کہ ”انما المشرکون نجس“ (مشرک گندے ہیں) اس آیت میں ”المشرکون“ جمع ہے اور ”نجس“ واحد ہے لیکن مصدر ہے اس لئے واحد کو جمع کی خبر بنانا درست ہے۔ (۱۲)

لہٰذا اگرچہ ”رجس“ نجاست کے مفہوم میں آتا ہے لیکن مذکورہ آیت میں وہ اس مفہوم میں استعمال نہیں ہوا ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں: ای سخط من عمل الشیطان

(اللہ کی ناراضگی کا ذریعہ اور شیطانی کام ہے) اسی طرح سے سعید بن جبیر نے اس کی تفسیر ''اثم'' (گناہ) اور زید بن اسلم نے ''شر'' کے لفظ سے کی ہے۔ (۱۳)

جمھور کی دوسری دلیل یه حدیث ھے:

عن ابی ثعلبة قال قلت یا رسول اللہ انا بارض قوم اهل الکتاب أفنا کل فی آنیتهم قال ان وجدتم غیرها فلا تاکلوا فیها وان لم تجدوا فاغسلوها وکلوا فیها (متفق علیه) ولاحمد وابی داؤد ان ارضنا ارض اهل الکتاب وانهم یاکلون لحم الخنزیر ویشربون الخمر فکیف نصنع بانیتهم وقدورهم قال ان لم تجدوا غیرها فارحضوها بالماء واطبخوا فیها واشربوا وللترمذی سئل رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن قدور المجوس قال انقوها غسلا واطبخوا فیها (۱۴)

حضرت ابو ثعلبہؓ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم لوگ اہل کتاب کے درمیان رہتے ہیں کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دوسرا برتن موجود ہو تو ان کے برتن میں نہ کھاؤ اور اگر دوسرا موجود نہ ہو تو اسے دھل کر اس میں کھاؤ (صحیح بخاری و مسلم) امام احمد اور ابو داود کی روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں زیادہ تر اہل کتاب آباد ہیں، اور وہ لوگ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں تو کیا ہم ان کے برتن اور دیگچی کو استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ دوسرا برتن نہ ہو تو اسے پہلے پانی سے دھو لو پھر اس میں کھانا پکاؤ اور پانی پیو، اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مجوس (پارسی) کے برتن کے متعلق سوال کیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے دھو کر اچھی طرح صاف کر لو پھر اس میں پکاؤ۔

صحابہ کرام کو اہل کتاب کے برتنوں کے استعمال میں پس و پیش تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ یہ لوگ انہیں برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں، اور ان کی نگاہ میں دونوں ہی نجس تھے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس خیال پر کوئی نکیر نہیں فرمائی بلکہ تائید کی اور برتن کو دھلنے کے بعد استعمال کرنے کو کہا (۱۵) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت میں بھی شراب کی نجاست کے سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ نجس ہوتی تو دوسری ناپاک چیزوں کی طرح دھلنے سے اس کا برتن بھی پاک ہو جاتا، حالانکہ حدیث میں یہ شرط ہے کہ دوسرا برتن دستیاب نہ ہو تو ان کے برتنوں کو دھو کر استعمال کرو، اس شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کی وجہ نجاست نہیں ہے بلکہ شراب اور خنزیر سے جو طبعی کراہت ہونی چاہئے وہ ایسے برتنوں کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی مگر یہ کہ مجبوری

ہو تو پھر ان کے دھونے پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ دوبارہ دھو کر استعمال کرنا چاہئے۔ (۱۶)

۳۔ شراب کی ناپاکی کیلئے علامہ ظفر احمد عثمانی نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ ناپاک چیزوں کا بیچنا اجماعی طور پر صحیح ہے حالانکہ شراب بیچنا باتفاق غلط ہے، اگر یہ پاک ہوتی تو اس کا بیچنا حرام نہ ہوتا لہٰذا شراب بیچنے کی حرمت کے باوجود اس کی پاکی کا قائل ہونا ''خرق اجماع'' ہے (۱۷) لیکن اس دلیل سے بھی اتفاق مشکل ہے کیونکہ شراب بیچنے سے صراحتاً حدیث میں منع کیا گیا ہے کیونکہ یہ شراب پینے میں تعاون ہے، اور معصیت کے سلسلہ میں تعاون بھی معصیت ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان الذی حرم شربها حرم بیعها (۱۸)

جس ذات نے اس کے پینے کو حرام قرار دیا اس نے اس کے بیچنے کو بھی حرام کہا ہے، اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر فرمایا:

ان اللہ ورسوله حرم بیع الخمر والخنزیر والمیتة والاصنام (۱۹)

اللہ عزوجل اور اللہ کے رسول نے شراب، خنزیر، مردار اور بتوں کے بیچنے کو حرام قرار دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ حشیش اور بھنگ جیسی جامد منشیات کی پاکی پر بھی تمام فقہاء کا اتفاق ہے لیکن اس کا بیچنا حرام ہے حالانکہ اس دلیل کے اعتبار سے اسے بھی ناپاک ہونا چاہیے۔

۴۔ علامہ عثمانی نے ایک دلیل یہ بھی ذکر کی ہے کہ کسی چیز کے بیچنے کی حرمت یا تو اس کی شرافت اور کرامت کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے آزاد انسان یا اس میں مال بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے، یا عمومی طور پر اس سے تمام لوگوں کو فائدہ حاصل کرنے کا حق ہو، جیسے کنویں وغیرہ کا پانی، یا ناپاکی کی وجہ سے بیچنا حرام ہو جیسے پیشاب اور نجاست۔ اب دیکھئے کہ شراب کے اندر عزت اور شرافت کا پہلو نہیں ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس میں مال بننے کی صلاحیت نہ ہو کیونکہ خود قرآن میں ہے کہ اس میں کچھ فائدے ہیں، اور اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ یہ اسلامی حکومت کے غیر مسلم شہریوں کے لئے مال ہے، اس لئے اسلامی حکومت میں بھی ان کے لئے آپس میں شراب کی خرید و فروخت درست ہے، اور اگر یہ اپنے میں سے کسی آزاد کو بیچنا چاہیں تو اس کی اجازت نہ ہوگی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد انسان مال نہیں ہے اور شراب مال ہے، لہٰذا اب حرمت کی ایک وجہ رہ جاتی ہے اور وہ ہے نجاست، (۲۰)

ظاہر ہے کہ یہ دلیل بھی اس دلیل کی طرح ہے جس میں اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ کبھی کسی چیز کی فروختگی حرام ہوتی ہے معصیت میں تعاون کی وجہ سے، جیسے دھات وغیرہ کے بت یقینی طور پر اپنے اندر مالیت رکھتے ہیں اور جمہور کے نقطہ نظر کے مطابق اس میں ظاہری ناپاکی نہیں ہے۔ (۲۱)

اس کے باوجود اس کی خرید وفروخت حرام ہے جیسا کہ گزشتہ حدیث میں اس کی صراحت ہے، اسی طرح سے نشہ آور جامد چیزیں باتفاق پاک ہیں لیکن ان کی فروختگی حرام ہے۔

قطع نظر اس سے کہ دونوں رایوں میں سے کون سی رائے راجح ہے، اتنی بات ضرور ثابت ہے کہ ناپاک کہنے والوں کی دلیل گرچہ اپنے موضوع پر صریح نہیں ہے لیکن اس سے غیر متعلق اور بالکل بے وزن بھی نہیں ہے اور پاک کہنے والوں کے اعتبار سے بھی "الکوہل" سے متعلق مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے، کیوں کہ وہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں کہ شراب کو اپنے پاس رکھا جائے، اس کی تجارت کی جائے، دوا میں ملا کر اسے پیا جائے، اس سے خوشبو کا آمیزہ تیار کر کے بدن اور کپڑے پر چھڑکا جائے یا کسی بھی طرح اس کا استعمال کیا جائے۔

البتہ اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کا جو نقطۂ نظر ہے اس سے کچھ حل نکل آتا ہے، ان کی رائے کی تفصیل یہ ہے:

"خمر" لغت کے اعتبار سے انگور کی کچی شراب کا نام ہے جب اس میں جوش اور تیزی آجائے۔(۲۲) انگور کی پکائی ہوئی شراب، کشمش اور کھجور کی شراب بھی اسی حکم میں شامل ہے کیوں کہ حدیث میں ہے:

الخمر من هاتين الشجرتين الكرمه والنخلة (۲۳)

خمر انگور اور کھجور کے شراب کا نام ہے۔

انگور اور کھجور کی شراب کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے گرچہ اس سے نشہ نہ ہو، اور ان کی شراب ناپاک ہے اور خرید وفرخت نادرست ہے، ان کے علاوہ نشہ آور سیال چیزیں اسی وقت حرام ہیں جب وہ نشہ کے بقدر پی جائیں ان کی خرید وفروخت درست ہے اور یہ پاک ہیں۔

علامہ تقی عثمانی کی تحقیق یہ ہے کہ اس وقت عام طور پر جو الکوہل دستیاب ہیں وہ کھجور اور انگور سے کشید نہیں کئے جاتے ہیں اس لئے دوا اور علاج کے مقصد سے ان کی خرید وفروخت جائز اور درست ہے۔(۲۴) اور عطریات میں جو الکوہل استعمال ہوتا ہے فنی ماہرین کی تحقیق واطلاع کے مطابق وہ نشہ آور نہیں ہیں اس لئے یہ ناپاک نہیں ہے۔

حوشی و تعلیقات

(۱) دیکھئے منح الجلیل ۲/۳۶۲ محمد علیش المالکی ط دارالمعرفة بیروت، التهذیب ۱/۱۸۷ حسین البغوی الشافعی ط دارالکتب العلمیه، المغنی ۱۲/۵۱٤ ابن قدامه

حنبلی ط دار عالم الکتب الریاض۔

(۲) دیکھئے الجامع لاحکام القرآن ٦/٢٨٨ الموسوعه الفقهية ٥/٢٧

(۳) رد المحتار ۱۰/۲۸، المجموع ۲/٥٦٤

(۴) دیکھئے الروضة الندیه ۱/٤٠، صدیق حسن قنوجی ط دارالکتب العلمیه بیروت۔

(۵) دیکھئے سبل السلام ۱/۳٦، محمد بن اسماعیل الصنعانی ط داراحیاء التراث بیروت۔

(۶) دیکھئے المجموع ۲/٥٦٤ ابوزکریا النووی ط دارالفکر بیروت۔

(۷) سورة المائده/ ۹۰

(۸) دیکھئے مصباح المنیر/ ۸۲ و ۲۲۷ احمد بن محمد الفیومی ط مکتبه لبنان لسان العرب ٦/ ٩٤، ٩٥

(۹) دیکھئے الروضة الندیة ۱/ ۳۹، نیل المرام ۲/ ٤٨٤ ط رمادی للنشر السعودیه۔

(۱۰) دیکھئے سنن ابن ماجہ ۳/ ۱۱۱ ابوعبد الله محمد بن یزید القزوینی ط مکتبة الفیصلية مکة المکرمة

(۱۱) علامہ ابن حزم کے نزدیک آیت میں مذکور تمام چیزیں ناپاک ہیں، اور ان کے ساتھ نماز باطل ہو جائیگی المحلی ۱/ ۱۹۹

(۱۲) دیکھئے عناية القاضی ۳/ ٥٠٤ احمد بن الخفاجی ط دار الکتب العلمیه بیروت۔

(۱۳) روح المعانی ۷/ ١٦ محمود الآلوسی احیا التراث العربی۔

(۱۴) مختصر تفسیر ابن کثیر ۱/ ۵۳۵

(۱۵) منتقی الاخبار مع نیل الاوطار ۱/ ۷۱ ۔ ط مکتبة الدعوة الدعوة الاسلامیه الازهر

(۱۶) اعلاء السنن ۱/ ۳۹۸ ظفر احمد عثمانی ط کراچی۔

(۱۷) نیل الاوطار ۱/ ۵۹

(۱۸) اعلاء السنن ۱/ ۴۰۰

(۱۹) الجامع الصحیح للمسلم/ ٥٩٥ ابوالحسین محمد بن الحجاج القشیری ط المکتبه العصریة بیروت۔

(۲۰) اعلاء السنن ۱/ ٤٠٠

(۲۱) حالانکہ قرآن میں بت کے لئے بھی "رجس" کا لفظ آیا ہے فاجتنبوا الرجس من الاوثان (الحج ۳۰)

(۲۲) ابن منظور لکھتے ہیں لان حقیقة الخمر انما هی العنب دون سائر الاشیاء لسان العرب ٥/ ٣٣٩

(۲۳) صحیح مسلم مع تکمله فتح الملهم ۹/ ۵۱۳

(۲۴) تکمله فتح الملهم ۷/ ۵۱۵، ۹/ ۳۹۹

(۲۵) نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے/ ۱۸۳

☆☆☆

حکیم محمد اکبر ارزانی اور ان کی طبی خدمات

ڈاکٹر عبدالباری فلاحی
استاذ جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

حکیم محمد اکبر ارزانی جنوبی ایشیا کے پہلے طبیب ہیں، جنھوں نے مشرق وسطی اور وسطی ایشیا سے آنے والے اطباء کے مقابلہ میں اپنا نام اور مقام پیدا کیا۔ وہ اپنے دور کے ایک کامیاب معالج، فنون طبیہ کے ایک وسیع النظر عالم، ایک طبی مدرس اور طبی کتابوں کے ایک ممتاز مصنف تھے[1] وہ ایسے وقت میں پیدا ہوئے جب باہر سے آنے والے اکابر اطباء کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا اور آخری عظیم طبیب علوی خاں تھے جو خود حکیم ارزانی کے معاصر تھے۔ علوی خاں کے بعد باہر سے کوئی نامور فاضل طبیب یہاں نہیں آیا۔ اب خود یہاں باکمال اور مجتہد اطباء پیدا ہو رہے تھے جن کے پیش رو حکیم محمد اکبر ارزانی تھے۔

ارزانی ہندی النسل تھے[2] سائرل الگوڈ کے مطابق ان کا وطن شیراز تھا اور وہ شیراز ہی سے اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ ان کا نام محمد اکبر اور عرفیت محمد ارزانی[3] تھی جیسا کہ خود ارزانی نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے[4] ایک مقام پر میر محمد اکبر بھی لکھا ہوا ہے[5] ان کے والد کا نام حاجی میر محمد مقیم تھا، جو نسلاً سادات سے تھے اور خواجہ محمد معصوم سرہندی کے خلیفہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۱ر جمادی الثانی ۱۰۹۷ھ مطابق ۱۶۸۶ء میں ہوا تھا[6]

تعلیم و تربیت: حکیم ارزانی نے طب سے پہلے متداول دینی علوم کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ فرماتے ہیں:[7]

''بعد از تصحیح عقائد دینیہ و اکتساب علوم متداولہ یقینیہ چوں از علم ابدان نیز بہرہ یافت۔''

''دینی عقائد کی تصحیح اور مروجہ دینی علوم کے حصول کے بعد علم طب حاصل کیا۔''

حکیم ارزانی صاحب نسبت و ارشاد باپ کے بیٹے تھے، اس لیے ان کو فقر و زہد ورثہ میں ملا تھا۔ باپ کے حسن تربیت سے اس ذوق کو جلا ملی۔ چنانچہ وہ تزکیۂ باطن کی طرف متوجہ ہوئے اور حاجی محمد آصف عبدالنبی احمد نگری کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ حکیم ارزانی کے والد نقشبندی سلسلۂ سلوک سے

وابستہ تھے لیکن خود حکیم ارزانی کا تعلق قادری سلسلہ سے تھا۔ وہ فرماتے ہیں:[8]

''ایں فقیر مرید جناب معارف مآب محبوب سبحانی و مقبول یزدانی خلاصۂ خاندان نبوی ولقاوۂ دودمان مرتضوی حضرت سید عبدالقادر جیلانی است''۔

''یہ خاکسار حضرت عبدالقادر جیلانی سے ارادت رکھتا ہے''۔

دینی مزاج کی وجہ سے ان کی سب سے پہلی تالیف بھی طبی ہونے کے ساتھ ساتھ دینی عنصر بھی رکھتی ہے یعنی جلال الدین سیوطی کی طب نبوی (عربی) کی تلخیص۔

حکیم ارزانی مطب میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں متعدد مقامات پر اپنے مطب کے واقعات درج کیے ہیں۔ علاج معالجہ کے نتیجہ میں جو تجربات ہوئے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:[9]

''ایں فقیر عمرے در تجارب صرف کردہ''۔

''اس حقیر نے تجربات میں ایک عمر صرف کی ہے''۔

ان کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہی فوج میں ملازمت کی بنا پر دکن کی مہم کے سلسلے میں ایک عرصہ تک جنوبی ہند میں تھے، ان کے مرشد بھی جنوبی ہند کے تھے۔ وہ فتح گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) کے بعد شاہی فوج کے ساتھ دہلی واپس ہوئے تھے جیسا کہ وہ مفرح القلوب کے دیباچہ میں عالم گیر کے آخری عہد میں دکن سے اپنی واپسی کا ذکر کرتے ہیں۔[10] اسی طرح طب اکبر کے دیباچہ میں بھی شاہ عالم گیر کی فتح دکن اور وہاں سے اپنی واپسی کا ذکر کیا ہے۔[11]

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکیم ارزانی شاہی فوج کی خدمت پر مامور تھے۔ کوئی طبی منصب یا شاہی خانوادے کی طبی خدمات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

حکیم ارزانی نے تدریسی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ میزان الطب کے سبب تالیف کے تحت لکھتے ہیں:[12]

''چوں اطفال فقیر و دیگر اعزہ در صدد خواندن علم طب بودند.....''

''میرے لڑکے اور دوسرے اعزہ علم طب حاصل کرنا چاہتے تھے تو میں نے تعلیم دی''۔

حکیم ارزانی کے والد محترم نقشبندی مجددی سلسلے کے بزرگ تھے، لیکن قادری سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسبت کے باوجود انھیں موسیقی سے دلچسپی تھی اور انھوں نے عہد اکبر کے مشہور و معروف موسیقار تان سین (وفات 1557) کی طرف منسوب کتاب کا ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا (تشریح الموسیقی)، جس کا مخطوطہ اسلامیہ کالج پشاور کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

وفات: حکیم ارزانی کی وفات ۱۷ ربیع الاول ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۲ء) کو دہلی میں ہوئی تھی۔[13]
ان کا مدفن دہلی کے باہر خواجہ باقی باللہ کے مزار کے قریب ہے جیسا کہ التحفۃ الحامدیہ (مصنفہ حکیم اجمل خاں) کے حاشیے پر ان کے ایک شاگرد حکیم شفیق الرحمٰن لکھتے ہیں:[14]

"وهو مات فی الدهلی ومدفنه خارج البلدة قریباً من مرقد خواجه باقی بالله رحمة الله علیه۔

"ان (ارزانی) کا وصال دہلی میں ہوا اور مدفن دہلی کے باہر خواجہ باقی باللہ کے مزار کے قریب ہے"۔

اولاد اور تلامذہ: حکیم ارزانی نے اپنی کتاب[15] میں اپنے بچوں کا ذکر کیا ہے اور ایک جگہ اپنی کتاب مفرح القلوب (ص ۵۱۲) میں اپنے ایک بیٹے محمد شکر اللہ کا نام بھی لکھا ہے۔ ان کی وفات ۲۵ محرم ۱۱۳۹ھ کو ہوئی۔ ان کے بیٹے سید حمایت اللہ عرف سید شاہ تھے، جن کی وفات ۱۱۹۳ھ میں ہوئی۔ ان کے بیٹے میر امام بخش، ان کے بیٹے میر پناہ علی، ان کے بیٹے حافظ سید محمد الیاس، ان کے بیٹے سید محمد مصطفیٰ اور ان کے بیٹے سید محمد ارتضیٰ ہیں جو ملا واحدی کے نام سے معروف ہیں۔[16]

حکیم ارزانی کے ایک چھوٹے بھائی حکیم محمد اصغر تھے جن کی ایک کتاب فارسی زبان میں تجربات المسلمین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے بڑے بھائی کا تذکرہ بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔

حکیم ارزانی کے ایک شاگرد جن کا نام حکیم عبدالجلیل تھا، ان کی ایک کتاب کا مخطوطہ موزہ ملی پاکستان (کراچی) میں محفوظ ہے (N.M.1961/1043)[17]۔ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے مثلاً تدبیر حفظ صحت، ماکول و مشروب وغیرہ۔

حکیم ارزانی کے ایک شاگرد کا نام حکیم پیرو تھا، جو اجین میں مقیم تھے، حکیم عبداللطیف سورتی (متوفی ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء) نے ان سے استفادہ کیا تھا۔[18]

تصنیفات: حکیم ارزانی نے قرابادین قادری کے دیباچہ میں اپنی تصنیفات کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ تلخیص طب النبی (طب النبی جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہے، اس میں مصنف نے اقوال اطباء کو احادیث شریفہ کے ساتھ تطابق کرکے جمع کیا ہے)۔

۲۔ طب اکبر ۳۔ مفرح القلوب

۴۔ میزان الطب ۵۔ تعاریف الامراض

۶۔ مجربات اکبری ۷۔ قرابادین قادری

ان کے علاوہ تین اور کتابیں بھی مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں جو غالباً قرابادین قادری کے بعد لکھی گئی تھیں۔

۸۔ طب ہندی ۹۔ علاج الصبیان۔

۱۰۔ تشریح الموسیقی

ذیل میں حکیم ارزانی کی تمام کتابوں کا تعارف پیش جا رہا ہے۔

(۱) **تلخیص طب النبی:** یہ ارزانی کی سب سے پہلی تالیف ہے اور علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ/۱۵۰۵ء) کی معروف کتاب طب النبی کی تلخیص ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ ذخیرہ شیرانی لاہور (4255/1202/6) میں موجود ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے لیکن تلخیص فارسی میں ہے۔

(۲) **طب اکبر:** یہ ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں لکھی گئی، جو دراصل نجیب الدین سمرقندی (۱۲۲۲ھ/۱۲۰۷ء) کی کتاب الاسباب والعلامات کی شرح از نفیس بن عوض کرمانی (۱۴۳۹ء) کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس میں حکیم ارزانی نے غیر ضروری اور غیر متعلق فلسفیانہ مباحث کو حذف کردیا ہے اور کئی جگہوں پر مفید اضافات کردیے ہیں۔ متعدد مقامات پر مصنف یا شارح سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس کو انھوں نے اورنگ زیب (عہد ۱۶۵۸۔۱۷۰۷ء) کے نام سے معنون کیا ہے۔ اس ترجمہ کا آغاز ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں ہوا اور تکمیل فرخ سیر کے عہد حکومت (۱۱۲۴ھ۔۱۱۳۱ھ) میں ہوئی تھی۔

یہ کتاب حکیم ارزانی کی معروف اور مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ ۴۱۲ اور دوسرا حصہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دونوں حصے مطبع منشی گلاب سنگھ لکھنؤ سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے بکثرت خطی نسخے پائے جاتے ہیں، صرف پاکستان میں ۵۳ نسخوں کا ذکر ملتا ہے۔[21]

اس کے مختلف ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ذیل میں اس کی تفصیلات درج کی جا رہی ہیں:

(۱) کلکتہ ۱۸۳۰ء، (۲) لکھنؤ ۱۲۷۷ھ، (۳) لکھنؤ ۱۲۸۷ھ، (۴) لکھنؤ ۱۲۸۹ھ، (۵) لکھنؤ ۱۸۶۴ء، (۶) لکھنؤ ۱۲۹۲ھ، (۷) لکھنؤ ۱۸۷۴ء، (۸) کان پور ۱۸۸۰ء، (۹) کان پور ۱۸۸۴ء، (۱۰) کان پور ۱۹۰۵ء، (۱۱) دہلی ۱۲۶۵ھ، (۱۲) بمبئی ۱۲۶۴ھ، (۱۳) بمبئی ۱۲۷۵ھ، (۱۴) بمبئی ۱۲۷۹ھ، (۱۵) مدراس ۱۸۳۸ء، (۱۶) لاہور ۱۲۷۱ھ، (۱۷) لاہور ۱۸۸۰ء، (۱۸) تہران ۱۲۷۵ھ۔

'طب اکبر' کا اردو ترجمہ جس کو حکیم محمد حسین نے انجام دیا، نول کشور پریس لکھنؤ سے طبع ہوا اور سندھی ترجمہ ہولی سنگھ اینڈ سنز کتب فروش کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

حکیم ابوعلی بن غلام علی امروہوی (متوفی ۱۲۷۲ھ) نے طب اکبر پر حواشی لکھے تھے۔[22]

(۳) مفرح القلوب: یہ محمود بن محمد چغمنی (متوفی ۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء) کی کتاب قانونچہ (عربی) کی فارسی میں مبسوط شرح ہے جو ۱۱۲۳ھ (۱۷۱۳ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن یہ مکمل شرح نہیں ہے۔ قانونچہ دس ابواب پر مشتمل ہے اور مفرح القلوب قانونچہ کی ابتدائی پانچ ابواب کی شرح ہے۔ حکیم ارزانی نے اپنی کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ

"آخری پانچ ابواب معالجات سے متعلق ہیں اور میں معالجات پر طب اکبر لکھ چکا ہوں، اسی لیے اس کتاب کے صرف پانچ ابواب کی شرح پر اکتفا کی ہے جو کلیات پر ہیں۔"

یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ چوتھا ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس پریس نے مفرح کا وہ اردو ترجمہ شائع کیا تھا جس کو حکیم نور کریم دریاباد ی (وفات ۱۸۷۱ء) نے انجام دیا تھا، بعد میں اس کا دوسرا نیا ترجمہ از حکیم محمد باقر سونی پتی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ سی سی آر یو ایم نئی دہلی کے زیر اہتمام ۲۰۰۵ء میں طبع ہوئی۔

اس کتاب کے کئی خطی نسخے مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ۳۰ نسخے صرف پاکستان میں ہیں، جیسا کہ منزوی نے فہرست مشترک میں درج کیا ہے۔ ۲۹

(۴) میزان الطب: یہ حکیم ارزانی کی مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مصنف اس کی وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میرے بچے اور دوسرے اعزاء طب کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کے لیے یہ کتاب لکھی جو مفرح القلوب کے بعد اور قرابادین سے پہلے کی تالیف ہے۔ گویا ۱۱۲۳ھ اور ۱۱۲۶ھ کے درمیان کی تالیف ہے۔

اس میں ۲۷۰ صفحات ہیں اور تین مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ ارکان، اخلاط اور ارواح سے متعلق ہے اور صرف ایک صفحہ پر محیط ہے، دوسرے مقالہ میں فصد، حجامت، علق اور مفرد و مرکب ادویہ کی درجہ بندی کا ذکر ہے اور بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ تیسرے مقالہ میں پچیس ابواب ہیں جن میں سر سے پاؤں تک کے امراض اور ان کے علاج کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب خالصتاً طب قدیم پر ہے۔ لیکن اس میں اخلاط و ارواح کے ساتھ "باد" کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

خلط چہار است، خون و بلغم، سوداء و صفراء و قوام۔ بدن از اخلاط است و حدوث اکثر امراض از زیادتی و کمی آں ہاست، خون گرم و تر و صفراء گرم و خشک و بلغم سرد و تر، سوداء سرد و خشک، لہٰذا 'باد' دخاں ست سرد و تر کہ از اخلاط متولد می شود، بیش تر از سوداء و بلغم متقدار می شود و آں در قوام بدن دخلے ندارد بر خلاف روح کہ اگر چہ آں نیز از اخلاط بر شکل بخاری شود، اما بقا و حیات بدن موقوف بر آں ست و مربی بدن۔

(ترجمہ) خلط چار ہیں، خون، بلغم، سوداء اور صفراء۔ بدن کی تعمیر اخلاط سے ہوتی ہے، اور اکثر و بیشتر امراض اخلاط کی کمی اور زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں۔ خون گرم و تر ہے۔ صفراء گرم و خشک ہے، بلغم سرد و تر اور سوداء گرم و خشک ہے مگر 'باد' ایک سرد و تر دخان ہے جو اخلاط سے اور سوداء اور بلغم سے پیدا ہوتا ہے۔ البتہ بدن کی تعمیر میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا برخلاف روح، جو اگرچہ اخلاط ہی سے بخار کی شکل میں پیدا ہوتی ہے مگر بدن کی حیات اور بقا کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے اور وہ بدن کی مربی ہوتی ہے۔

میرے خیال میں حکیم ارزانی کا یہ اضافہ بے محل ہے۔ 'باد' خالصتاً آیورویدکا نظریہ ہے۔ آیوروید میں اخلاط تین ہیں واتا (باد)، کفا، پتا، اس کے برعکس طب قدیم میں اخلاط چار ہیں۔ خلط کی تعریف میں دونوں طبوں کا اختلاف ہے۔ اسی لیے آیوروید میں 'خون' اخلاط میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ دھاتو (عمود بدن) میں شامل ہے۔ اسی طرح طب قدیم ارواح ثلاثہ کی قائل ہے اور روح کے افعال و منافع بھی آیوروید سے مختلف ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ارزانی نے 'باد' کو سرد و تر اور بیشتر نے سوداء و بلغم سے مرکب لکھا ہے لیکن محمد قاسم فرشتہ جو آیوروید کا عالم تھا اور جس نے اختیارات قاسمی (دستور الاطباء) میں آیوروید کی تفصیلات قلم بند کی ہیں اس نے 'باد' کو سرد و خشک اور بلغم و صفراء سے مرکب لکھا ہے۔ معاصر اطباء نے بھی اس کو سرد و خشک قرار دیا ہے۔ ۳۲

"میزان الطب" کلکتہ سے ۱۸۳۶ء میں، کان پور سے ۱۲۶۸ھ اور ۱۸۷۲ء میں اور لکھنؤ (نول کشور) سے نویں بار ۱۸۹۳ء میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے متعدد اردو ترجمے بھی شائع ہوئے۔

(۱) اردو ترجمہ از حکیم محمد حسن، ناشر حاجی عبدالرحمٰن خاں بن روشن خان
(۲) اردو ترجمہ از حکیم حامد علی خان، نول کشور لکھنؤ
(۳) اردو ترجمہ از حکیم عبدالحکیم، مطبع نامی لکھنؤ، ۱۹۱۷ء
(۴) اردو ترجمہ بعنوان طب عزیزی از حکیم اوصاف علی خاں رضوی لکھنوی، مطبع ثمر ہند ۱۸۸۵ء
(۵) اردو ترجمہ از حکیم عبدالواحد، مکتبہ ابراہیمیہ، دہلی ۱۹۲۳ء
(۶) اردو ترجمہ از حکیم عبدالواحد، مکتبہ ابراہیمیہ، دہلی ۱۹۵۶ء

میزان الطب کو مفتاح العلاج کے نام سے محمد ہاشم قادری بن حاجی محمد شریف (متوفی ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء) نے اشعار کا جامہ پہنایا، اس کا مخطوطہ خلیل الرحمٰن داؤدی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔ ۳۳ میزان الطب کے ۶۱ خطی نسخے صرف پاکستان میں ہیں۔ ۳۴

(۵) حدود الامراض: قرابادین قادری کے دیباچے میں حکیم ارزانی نے اس کا نام تعاریف الامراض لکھا ہے مگر اصل کتاب میں حدود الامراض ہی لکھا ہے۔ یہ واحد کتاب ہے جو عربی میں ہے[۳۴] بقیہ فارسی میں ہیں۔

قرابادین قادری کے دیباچہ کے مطابق حدود الامراض کا شمار ترتیب کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے۔ مگر اس کتاب کے دیباچہ کے لحاظ سے ارزانی کی یہ تیسری کتاب ہے یعنی پہلے نمبر پر تلخیص طب النبی، دوسرے نمبر پر طب اکبر، یہ ممکن ہے کہ ارزانی نے حدود الامراض کی تالیف طب اکبر کی تکمیل کے بعد ہی شروع کی ہو (اس لیے یہ تیسری ہوئی) اور اختتام مفرح القلوب اور میزان الطب کے بعد ہوا ہو (اس لیے یہ پانچویں نمبر پر ہوئی)۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۲۶۸ھ میں مطبع عزیزی سے اور دوسری بار ۱۳۱۳ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوئی۔

اس کتاب کی فارسی زبان میں فصول الاعراض کے نام سے شرح لکھی گئی۔ شارح کا نام حکیم سید ابوالقاسم معروف بہ میر قدرت اللہ قادری ہے۔ یہ شرح چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع فخر المطابع دہلی سے ۱۲۷۲ھ میں طبع ہوئی۔

(۶) مجربات اکبری: یہ کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ متفرق نسخوں اور ترکیبوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں معالجات کی بھی تخصیص نہیں ہے بلکہ شکار کرنے کے طریقے، رنگ بنانے کے نسخے اور مختلف دھاتوں کے کشتہ بنانے کی ترکیبیں درج ہیں۔ بیطرہ (علاج حیوانات) پر بھی ایک فصل ہے۔ زیادہ تر نسخے طب ہندی سے ماخوذ ہیں۔ خود حکیم ارزانی نے لکھا ہے کہ میں اصحاب تجربہ سے سن کر چند تراکیب متفرق کاغذات پر لکھتا رہتا تھا، چونکہ ان بے ترتیب کاغذوں سے بوقت ضرورت مطلوبہ نسخہ نکالنا مشکل ہو رہا تھا اس لیے خیال آیا کہ ان کو بالترتیب قلم بند کردوں۔ شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں متعدد فوائد ہیں۔ ان میں دھاتوں کو کشتہ کرنے، نمک اور کھار نکالنے کی ترکیبیں، سیماب کی اصلاح و تدبیر اور استعمال کے طریقے ہیں۔ پھر امراض کے مجربات ہیں۔

مجربات اکبری کے مخطوطات کی تعداد صرف پاکستان میں ۳۱ تک پہنچتی ہے۔[۳۵] یہ کتاب مختلف مقامات سے کئی دفعہ شائع ہو چکی ہے۔ لکھنؤ سے ۱۲۸۰ھ میں، کان پور سے ۱۸۸۳ء میں، بمبئی سے ۱۸۸۴ء میں اور دوبارہ بمبئی سے ۱۸۹۳ء میں۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ جس کو حکیم سید واجد علی ہاشمی نے انجام دیا، نول کشور لکھنؤ سے ۱۲۷۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مطبع سے اس ترجمے کی ساتویں طباعت ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی۔

(۷) قرابادین قادری: ارزانی نے اس کی تصنیف کا آغاز ۱۱۲۶ھ[۳۶] میں کیا جیسا کہ وہ لکھتا ہے۔

"دریں زمانہ کہ در ۱۱۲۶ ہجری یکہزار و یکصد و بست و شش است از ملہم غیب بدان ما مور شدہ کہ قرابادینی بنویسد کہ بوفور فوائدانی یوسائید کسی ننوشتہ باشد۔"

"اس زمانے میں یعنی ۱۱۲۶ھ میں ملہم غیب سے اس بات پر مامور ہوا کہ ایک ایسی قرابادین لکھوں جس کو کسی نے اتنے کثیر فائدوں کے ساتھ نہ لکھا ہو"۔

اس کی تکمیل ۱۱۳۰ھ/۱۸۱۷ء میں ہوئی۔[۳۷] یہ پانچ صفحات پر مشتمل فارسی میں ایک جامع قرابادین ہے، اس میں تحیس ابواب ہیں، اس کو امراض کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے یعنی پہلے امراض راس کے مرکبات اور پھر آخر تک اسی طرح معروف ترتیب کے ساتھ۔

مصنف نے اس کو عبدالقادر جیلانیؒ کی جانب منسوب کرتے ہوئے اس کا نام قرابادین قادری رکھا۔[۳۸]

"ببرکات روحہا المطہرۃ ایں نسخہ را بقرابادین قادری موسوم ساختہ"

"میں نے ان کی یعنی عبدالقادر جیلانیؒ کی برکتوں سے اس نسخہ کو قرابادین قادری کے نام سے موسوم کیا۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۱۳۰ھ/۱۸۱۷ء میں لکھی گئی اس کتاب میں انواع مرکبات میں سے خمیرہ غائب ہے۔ قرابادین قادری میں ایک بھی خمیرہ کا بیان نہیں ہے جب کہ مصنف نے ۲۶ سال بعد اپنی تصنیف مجموعۂ بقائی میں بڑی تعداد میں خمیرہ جات کا ذکر کیا ہے مثلاً خمیرہ مروارید، خمیرۂ ابریشم، خمیرۂ گاؤزبان وغیرہ۔ قرابادین کے ہر باب کے آخر میں ایک مستقل عنوان ادویہ ہندیہ کا ہے۔

ارزانی نے اپنی کتاب میں جہاں اطباء متقدمین کی عربی و فارسی قرابادینوں سے نسخے درج کیے ہیں وہیں انھوں نے اپنے ترتیب کردہ نسخے بھی بیان کیے ہیں جن میں شربت ارزانی، جوارش کمونی اکبر، شربت اعجاز اور مرہم اعجاز بہت مقبول ہوئے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل نسخے بھی ارزانی کے ترتیب کردہ ہیں جیسا کہ خود ان کا بیان ہیں۔

(۱) شربت گاؤزباں عنبری[۳۹] (ادویہ امراض دل) و سکنجبین تفاحی[۴۰] (ادویہ امراض معدہ) کمادور معدہ (ادویہ امراض معدہ)[۴۱] شربت سنا[۴۲] (ادویہ امراض امعاء)، مرہم اکبر[۴۳] (ادویہ امراض پستان وخصیہ وغیرہ)۔

قرابادین قادری کے مخطوطات صرف پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔[۴۴] جہاں تک اس کتاب کی طباعت کی بات ہے، ۱۲۷۶ھ میں میرٹھ سے، ۱۲۷۷ھ میں بمبئی سے اور ۱۲۸۶ھ میں دہلی سے

شائع ہو چکی ہے۔

اردو تراجم کیمیا عناصری از مولوی حکیم محمد نور کریم دریابادی، نول کشور لکھنؤ۔

(۲) کیمیاء نظری از منشی نذیر احمد سیماب، شیخ برکت اللہ اینڈ سنز لاہور، بن مدارد۔

مذکورہ بالا سات کتابوں کے علاوہ ارزانی کی چند مزید طبی کتابوں کا سراغ ملتا ہے اور ان کا تعلق قرابادین قادری (۱۱۳۰ھ) کی تصنیف کے بعد کے دور سے ہے۔

(۸) **طب ہندی:** اس کتاب کا ذکر نزہۃ الخواطر اور الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند میں ملتا ہے۔

(۹) **علاج الصبیان:** رضا لائبریری رام پور میں ایک کتاب علاج الصبیان کے نام سے حکیم ارزانی کی طرف منسوب ہے۔ کتب خانہ شبلی نعمانی (ندوۃ العلماء) لکھنؤ میں ایک کتاب شفاء الصبیان کے نام سے ارزانی کی طرف منسوب ہے جو ۵۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں دو مقالات ہیں، پہلے مقالے میں ۶ فصول ہیں جن میں ایام حمل سے ایام رضاعت کی تدابیر پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے مقالے میں ۲۵ فصول ہیں۔ ان میں امراض وعلامات اور معالجات اطفال کا ذکر ہے۔ [۳۵] اس کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے:

> ایں رسالہ از بیماری طفلان مرتب گشت و انتہا ان الفاظ پر ہوتی ہے: بقول پیر شش ماہ از ...... کہ معیاد ...... شکم عارض شود۔"

۱۰۔ **تشریح الموسیقی:** اس کا تعلق طب سے نہیں ہے اور یہ عہد اکبر کے نامور موسیقار تان سین (متوفی ۱۵۸۷ء) کی طرف منسوب کتاب بدھ پرکاش کا ہندی سے اردو ترجمہ ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں ہے۔

(۱۱) **بیاض مجربات:** اس کا ایک خطی نسخہ نظامیہ طبیہ کالج (حیدرآباد) کے کتب خانے میں ہے جس پر بیاض مجربات لکھا ہوا ہے اور ارزانی کی طرف منسوب ہے۔ [۳۶] (بقیہ آئندہ شمارہ میں)

حواشی:

۱۔ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۸۱۔۲۸۲

۲۔ ملا واحدی جو ارزانی کے اخلاف میں سے تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ ارزانی نے طب یونانی کی کتابوں کو عربی سے فارسی میں منتقل کر کے طب کو عام اور ارزاں کر دیا تھا، اسی وجہ سے ان کا نام ارزانی پڑ گیا تھا۔ (میرے زمانے کی دلی، ص ۱۰۸

۳۔ طب اکبر ص ۲، ۷، مجربات اکبری ص ۱، حدود الامراض ص ۳

۴۔ قرابادین قادری ص ۳

۵۔ طب اکبر ص ۳

۶۔ میرے زمانے کی دلی، ص ۵۹

۷۔ طب اکبر، ص ۳

۸۔ قرابادین قادری، ص ۳

۹۔ قرابادین قادری، ص ۴۳۴

۱۰۔ مفرح القلوب، ص ۶۲۳

۱۱۔ طب اکبر، ص ۳

۱۲۔ میزان الطب، ص ۲

۱۳۔ میرے زمانے کی دلی از ملا واحدی، نقش ثانی، کراچی، ص ۱۰۸۔ حکیم اجمل خاں نے ارزانی کی تاریخ وفات ۱۲۱۰ھ / ۹۵-۱۷۹۴ء لکھی ہے (فہرست کتب خانہ رام پور مطبوعہ ۱۹۰۲ء، پرشین لٹریچر حصہ ۲، ص ۳۶۸)

۱۴۔ التحفۃ الحامدیہ، مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء، ص ۲۳

۱۵۔ میزان الطب، ص ۲

۱۶۔ میرے زمانے کی دلی، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۱۷۔ فہرست مشترک، ص ۶۲۳

۱۸۔ نزہۃ الخواطر (الجزء السابع)، ص ۳۱۷۔۳۱۶

۱۹۔ قرابادین قادری (فارسی) مطبوعہ منشی نول کشور، ص ۲

۲۰۔ طب اکبر، ص ۳

۲۱۔ فہرست مشترک ۸۵۸

۲۲۔ نزہۃ الخواطر (الجزء السابع) ص ۱۷۔۱۸۔ حکیم ابو علی بن غلام علی امروہوی ۱۲۰۳ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فقہ، حدیث اور عربی زبان سید محمد عبادت امروہوی سے حاصل کی اور طبی کتابوں کا علم رضی الدین امروہوی سے حاصل کیا اور باندہ میں ۲۵ سال تک درسی خدمات انجام دیں۔ ان کی تصانیف میں طب اکبر پر حواشی کے علاوہ ہادی الحق بفضل فی الرد علی تحفۃ المسلمین، حجۃ الایمان، کشف الدین فی اثبات العزاء علی الحسین شامل ہیں۔

۲۹۔ فہرست مشترک

۳۱۔ میزان الطب، ص ۳۔۴

۳۲۔ Theories and Philosophies of Medicine، آئی ایچ ایم آر، دہلی، ص ۳۲۲

۳۳۔ فہرست مشترک، ص ۸۵۸

۳۴۔ فہرست مشترک، ص ۸۵۸

۳۵۔ فہرست مشترک، ص ۲۸۵

۳۶۔ قرابادین قادری، ص ۲

۳۷۔ ایضاً ص ۳۳۱

۳۸۔ قرابادین قادری، ص ۲

۳۹۔ قرابادین قادری، ص ۱۷۷

۴۰۔ قرابادین قادری، ص ۳۳۰

۴۱۔ قرابادین قادری، ص ۳۳۶

۴۲۔ قرابادین قادری، ص ۳۱۲

۴۳۔ قرابادین قادری، ص ۳۳۱

۴۴۔ فہرست مشترک، ص ۹۸۵

۴۵۔ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ نمبر ۴۵، مقالہ رئیس نعمانی، ص ۳۸۴، مطبوعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۸۸ء

۴۶۔ خدا بخش جرنل ۱۹، ۲۰، ۲۱، ص ۴۲

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

عبدالبر اثری فلاحی

اپریل ۲۰۱۰ء سے ''چلڈرین رائٹ آف رن ٹو فری اینڈ کمپلسری ایجوکیشن ایکٹ ۲۰۰۹ء'' نافذ ہوا ہے۔ حکومت کا بچوں کے لئے بنیادی تعلیم کو لازمی اور مفت تسلیم کرنا ایک خوش آئند پہلو ہے۔ بالخصوص مہنگی تعلیم کے تناظر میں یہ ایک قابل ستائش اقدام ہے۔ توقع ہے کہ لاکھوں بچے جو اسکولوں کا منھ تک نہیں دیکھ پاتے تھے وہ اب تعلیم کا فیض پائیں گے اور ڈراپ آؤٹس کی شرح میں بھی کمی آئے گی۔ ورنہ رپورٹ یہ ہے کہ پہلی جماعت میں داخلہ لینے والے سو بچوں میں سے صرف بارہ بچے ہی کالج تک پہونچ پاتے ہیں۔

۵ سال سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کے لئے (آٹھویں کے معیار تک) یہ حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس عمر کے بچوں کو لامحالہ اسکولوں میں داخل کرنے کرانے کا اہتمام کیا جانا چاہئے۔ اس ضمن میں پرائیویٹ اسکولوں کو بھی اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ ۲۵ فیصد ایسے طلبہ کا داخلہ لیں جو خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے والے ہیں اور ان کو مفت تعلیم فراہم کریں۔ ڈونیشن، کیپیٹیشن اور والدین کے انٹرویو پر بھی پابندی لگائی گئی ہے۔ اسکریننگ سے بھی روکا گیا ہے اور یہ ہدایت کی گئی ہے کہ عمر کی مناسبت سے درجات میں داخلہ دیا جائے۔ معیار کو برقرار رکھنے کے لئے خصوصی ٹریننگ کا اہتمام کیا جائے۔ طلبہ و اساتذہ کی تعداد میں بھی توازن کو برقرار رکھنے کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ ہر ۳۰ طالب علم پر ایک استاذ ہونا چاہئے اور چھٹی تا آٹھویں جماعتوں میں ہر موضوع کا ٹیچر ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ پانچویں جماعت تک ۲۰۰ دن اور چھٹی تا آٹھویں جماعت تک ۲۲۰ دن اسکولوں میں پڑھائی لازم ہے۔ انتخابات، مردم شماری اور سانحہ کے متعلق انتظامات کے علاوہ اساتذہ کو دوسرے کاموں میں استعمال کرنے پر بھی پابندی عائد کی گئی ہے۔ اس کے نفاذ کے لئے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت دونوں کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ ۵۵ فیصد اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی اور ۴۵ فیصدی اخراجات ریاستی حکومت کے ذمہ ہوں گے۔

اس ایکٹ کے ان اہم مندرجات کے مطالعہ سے کچھ مثبت پہلو سامنے آتے ہیں تو وہیں کچھ منفی

پہلوؤں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مثبت پہلوؤں سے استفادہ کیا جانا چاہئے اور منفی پہلوؤں سے تحفظ کے لئے اصلاح و ترمیم کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔

اس ایکٹ میں جو سب سے خطرناک بات ہے وہ یہ ہے کہ نہ فیل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی کو اسکول سے نکالا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں معیار تعلیم کو باقی رکھنا ممکن نہیں ہے۔ نہ معیاری تدریس ممکن ہے۔ ناکامی کا خوف ختم ہوجانے کی وجہ سے مسابقتی صلاحیتوں پر مضر اثرات پڑیں گے اور کارروائی کا خوف ختم ہوجانے کی وجہ سے نظم و ڈسپلین قائم کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ چیزیں متاثر ہوئیں تو تعلیم برائے نام تو ہوسکتی ہے لیکن برائے کام کا تصور نہیں کیا جاسکتا اسی طرح یہ بنیادی تعلیم ناقص یا خراب ہوئی تو اعلیٰ تعلیم بھی بہتر نہیں ہوسکتی۔

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

''پہلی اینٹ اگر معمار نے ٹیڑھی رکھ دی تو ثریا تک پوری دیوار ٹیڑھی ہی رہے گی۔''

معیار تعلیم اگر باقی نہیں رہتا تو مفت تعلیم کا حق بے معنی ہے۔ تو پھر نتیجہ یہی نکلے گا کہ جو لوگ معیاری تعلیم چاہتے ہیں انھیں اپنے خرچ پر علاحدہ تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ یا ٹیوشن کی شکل میں اس کمی کو دور کرنا ہوگا اور دونوں صورتوں میں خرچ کا اضافی بوجھ والدین کے اوپر پڑنے والا ہے۔

ایسی صورت میں یہ ایکٹ بے سود قرار پائے گا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ معیاری تعلیم کو یقینی بنانے کے لئے اس ایکٹ میں ضروری تبدیلی اور ترمیمات کی جائیں۔

دوسری خطرناک بات یہ ہے کہ اس ایکٹ کے تحت اداروں کا رجسٹریشن ضروری قرار دیا گیا ہے۔ بصورت دیگر ان پر جرمانے عائد کئے جائیں گے اور ان کو بند بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں بلا رجسٹریشن چل رہے اداروں سے علم کی جو روشنی پھیل رہی ہے ان کے بند ہوجانے کا خطرہ ہے۔ بالخصوص اس کی زد میں دینی مدارس آسکتے ہیں اور ایسی صورت میں مسلمانوں کو شدید خسارے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے بھی اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔

تیسری خطرناک بات یہ ہے کہ حق کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن عملی افادیت پر توجہ نہیں دی گئی ہے۔ لہٰذا بہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہونا ممکن نظر نہیں آرہا ہے بلکہ اندیشے ظاہر کئے جارہے ہیں کہ کہیں بچہ مزدوری ایکٹ جیسا معاملہ اس کا بھی نہ ہوجائے۔ وجہ یہ ہے کہ جس قدر تعلیم (یعنی آٹھویں جماعت تک) مفت فراہم کرنا طے کیا گیا ہے اسے پورا کر لینے والا کسی سرٹیفکٹ کا حامل نہیں بنتا۔ کم از کم دسویں کی سرٹیفکٹ کی کچھ اہمیت تھی ہے لیکن وہ لازمی تعلیم کے دائرے سے باہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو اپنی کوشش سے یہ

سرٹیفکٹ حاصل کرے وہی کسی درجے میں کامیاب قرار دیا جاسکتا ہے اور جو نہ کرے صرف لازمی تعلیم کے دائرے تک تعلیم حاصل کر کے رک جائے، اس کی کہیں کھپت یقینی نہیں کیوں کہ خود حکومت چوتھے درجے کی ملازمت کے لئے دسویں کی سرٹیفکٹ مانگتی ہے جو لازمی تعلیم کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی اسے حاصل نہیں پھر بھلا وہ کہاں اور کیا کام پاسکے گا؟ اس لئے کم از کم اس سطح تک اس تعلیم کی حد درازکی جانی چاہئے۔

اس ضمن میں اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ پچھلے دنوں کابینہ نے غیر ملکی یونیورسٹیوں کو اجازت دینے سے متعلق بل پاس کیا ہے اور عنقریب وہ پارلیمنٹ میں زیر بحث آنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر ملکی ادارے اپنے مفادات کے تحت یہاں کام کرنا چاہتے ہیں اس صورت میں اعلیٰ تعلیم اور مہنگی ہوگی اور عام آدمی کی رسائی سے باہر ہو جائے گی۔ یہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور بالفاظ دیگر اعلیٰ دماغ پر غیروں کا قبضہ ہو جائے گا اور اس صورت میں اس بنیادی تعلیم کی معنویت اور بھی کچھ نہیں رہ جائے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سلسلے میں ہونے والے ردعمل کو ٹھنڈا کرنے اور رکھنے کے لئے یہ بل لایا اور نافذ کیا جارہا ہے۔ الاماں والحفیظ۔ سوچئے سو بار سوچئے اور لائحہ عمل ترتیب دیجئے۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

Mob. 9450931476
9838932152
Prop. Altaf Bhai
Bharat
Batterries
T. 5-24, Munshi Pulia, Indira Nagar,
Lucknow.

جامعہ کے لیل و نہار

عبدالرقیب فلاحی

۱۔ کلیۃ الدعوۃ میں دس روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام:

کلیۃ الدعوۃ جامعۃ الفلاح میں تعطیل گرما کے دوران دس روزہ دعوتی و تربیتی کیمپ کا انعقاد ہوا۔ اس کیمپ کے روح رواں مشہور داعی ریاض احمد موسیٰ ملیباری صاحب تھے۔ ان کے ساتھ دہلی کی چھ رکنی دعاۃ ٹیم بھی شریک کیمپ ہوئی، دس روزہ کیمپ میں شرکاء کی تعداد ۶۰ تا ۷۰ کے درمیان رہی۔ تعطیل گرما کے باوجود طلب کی ایک اچھی تعداد نے اس کیمپ سے استفادہ کیا اور کافی دلچسپی و مستعدی کے ساتھ پورے کیمپ میں شریک رہے۔ یہ کیمپ تعلیم، تزکیہ اور عملی تربیت تینوں پہلوؤں پر مشتمل تھا جو انتہائی موثر رہا، تہجد کی نماز سے شروع ہو کر عشاء تک کا پورا پروگرام انتہائی کامیاب تھا، جس میں فیلڈ ورک بھی شامل رہتا تھا۔ قبل از عصر بلریا گنج کے اطراف و جوانب میں مختلف گروپس کی شکل میں دعاۃ پابندی سے نکلتے تھے اور برادران وطن سے ملاقات کر کے ان کو اسلام کی دعوت دیتے، اسلام کی حقانیت و صداقت مدلل انداز میں پیش کرتے جس سے متاثر ہو کر برادران وطن خوشی خوشی کلمہ طیبہ بھی پڑھ لیتے۔

الغرض یہ دس روزہ کیمپ اپنی معنویت اور افادیت کے لحاظ سے کافی کامیاب اور موثر ثابت ہوا، اگر اس طرح کی فضا عام ہو تو انشاء اللہ پورے ملک میں اسلام اور اہل اسلام کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں ہیں ان پر بہت جلد قابو پایا جاسکتا ہے۔

۲۔ مہمانان کویت کی جامعہ میں آمد:

۵ تا ۸ را پریل ۲۰۱۰ء جامعہ میں عالم عرب کے مشہور داعی و مبلغ الشیخ عبدالحمید جاسم البلالی اپنی چھ رکنی ٹیم کے ہمراہ تشریف لائے، چار دن قیام کیا۔

۵ را پریل ۲۰۱۰ء سوموار کو یہ قافلہ بابت پور (بنارس) ائرپورٹ سے جامعہ کے لئے روانہ ہوا اور ظہر بعد جامعہ پہونچا، بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں ایک عمومی نشست منعقد ہوئی جس میں البلالی

صاحب نے ''الدین والمعاملہ'' کے عنوان پر انتہائی مؤثر خطاب کیا جس کی ترجمانی محترم ناظم جامعہ نے فرمائی۔ قصبہ کے مصلیان اور دوسرے لوگ بھی نشست میں شریک رہے اور بھرپور استفادہ کیا۔ ۶/اپریل ۲۰۱۰ء منگل کی صبح کو یہ قافلہ بلریا گنج کے اطراف میں نو تعمیر شدہ مساجد کی زیارت کے لئے روانہ ہوا اور ظہر تک واپسی ہوئی، ظہر کے بعد ابو اللیث ہال میں معلمین ومعلمات کے لئے ''کیف تکون معلما؟'' کے عنوان پر ایک محاضرہ منعقد ہوا، جس میں جملہ معلمین ومعلمات شریک ہوئیں۔

۷/اپریل ۲۰۱۰ء بروز بدھ ۹/ بجے صبح کلیۃ البنات کی طالبات کے لئے بھی ایک پروگرام رکھا گیا، یہ پروگرام درس گاہ کلیۃ البنات میں منعقد ہوا اور محترم الشیخ عبد الحمید جاسم البلالی صاحب نے ''اسالیب افساد المرأۃ المسلمۃ'' کے عنوان پر پر مغز گفتگو کی جس کی ترجمانی بزبان اردو محترم ناظم جامعہ نے انتہائی دلنشین انداز میں فرمائی۔

۸/اپریل ۲۰۱۰ء بروز جمعرات یہ قافلہ اپنا آخری سفر طے کرتے ہوئے صبح ۸/ بجے بابت پور (بنارس) ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوا......

۳. پانچ روزہ ریفریشر کورس برائے معلمین و معلمات:

مورخہ ۳۰/اپریل تا ۴/مئی ۲۰۱۰ء جامعہ کے معلمین ومعلمات کے لئے ریفریشر کورس کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاحی اجلاس ۳۰/اپریل ۲۰۱۰ء بروز جمعہ بوقت ۱۲:۳۰/ بجے ابو اللیث ہال میں محترم ڈاکٹر عبد القیوم صاحب (ایگزیکیٹو آفیسر این.آئی.او.ایس.) کی صدارت میں منعقد ہوا، تلاوت قرآن مجید سے اجلاس کا آغاز ہوا اس کے بعد طلبہ نے ترانہ جامعہ پیش کیا شیخ التفسیر والحدیث کلیۃ البنات محترم احسان الحق فلاحی صاحب نے تذکیری کلمات سے مستفید کیا، اس کے بعد ناظم جامعہ محترم مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے اپنے افتتاحی خطاب میں فرمایا کہ اس ریفریشر کورس کا مقصد دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا ہے اور یکسانیت کی وجہ سے پیدا شدہ تھکن اور اکتاہٹ کا ازالہ ہے، تاکہ تازہ دم ہو کر تدریسی سفر کو جاری رکھا جا سکے، انھوں نے کہا کہ کامیاب تدریس کے لئے معلمین ومعلمات کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) اخلاص: ہمیں یہ کام خلوص وللٰہیت سے کرنا چاہئے، درحقیقت یہ کام اتنا عظیم ہے کہ دنیا میں اس کا اجر دیا ہی نہیں جا سکتا۔

(۲) اخلاق: اخلاق کے لحاظ سے ہمیں اپنے آپ کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے، معلمین کو اعلیٰ اخلاق کی کھلی کتاب ہونا چاہئے، محبت، شفقت، صبر وتحمل، تواضع وخاکساری جیسے اعلیٰ

اوصاف سے متصف ہونا چاہئے۔

(۳) اساتذہ وطلباء کا باہمی تعلق انتہائی مضبوط ومستحکم ہونا چاہئے، اساتذہ طلبہ کے روحانی باپ ہیں لہٰذا ان کے اندر باپ اور بیٹے جیسا تعلق ہونا چاہئے۔

(۴) مختلف علوم وفنون کے سلسلے میں ہمارے اندر تعصب وتنگ دلی نہیں ہونی چاہئے، ہر فن کے تعلق سے رویہ موافقانہ ہونا چاہئے۔

(۵) طلبہ وطالبات کے اندر مخفی صلاحیتوں کا انکشاف کرکے مناسب فرائض اور ذمہ داریاں ان کے سپرد کی جائیں۔

(۶) طلبہ کی حوصلہ افزائی اور تشجیع ہونی چاہئے اس سے طلبہ وطالبات کے اندر خود اعتمادی اور نفسیاتی برتری پیدا ہوتی ہے۔

(۷) کلاس میں طلبہ سے سوالات بھی کئے جانے چاہئے تاکہ ان کی توجہ معلم کی طرف مکمل ہو جائے، بخاری شریف کی روایت کے مطابق اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مختلف مواقع پر سوالات کئے ہیں۔

اس کے بعد مہمان خصوصی جناب عبد الغفور انصاری صاحب معاون سکریٹری شعبہ تعلیم مرکز جماعت اسلامی ہند نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ پانچ روزہ ٹیچرس ٹریننگ کورس انتہائی اہم و افادیت کا حامل ہے، مختلف دینی اداروں میں اس طرح کے کیمپ منعقد کئے جاتے ہیں اور ان کا مقصد تدریس کے میدان میں پیدا ہونے والے جدید تعلیمی رجحانات سے استفادہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد صدر مجلس جناب ڈاکٹر عبد القیوم صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ایک معلم کی اہمیت یقیناً ماں باپ سے زیادہ ہے، طلبہ کے ذہن میں وسعت اور کشادگی پیدا کی جانی چاہئے۔

محترم موصوف نے جامعہ کے بارے میں اچھے تأثرات کا اظہار کرتے ہوئے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔

(۴) جمعیۃ الطلبہ کا سالانہ تعلیمی مظاہرہ:

۱۳/مئی ۲۰۱۰ء جمعرات کو ابو اللیث ہال میں جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے یک روزہ تعلیمی مظاہرہ منعقد ہوا، تعلیمی مظاہرہ کا آغاز صبح ۸/ بجے محترم مولانا محمد اسماعیل فلاحی صاحب کی نگرانی میں ہوا، افتتاحی سیشن کی صدارت محترم مولانا محمد سلامت اللہ اصلاحی (مہتمم تعلیم وتربیت) نے فرمائی۔ طلبہ نے مختلف زبانوں میں تقریریں کیں اور اپنی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا، اس پروگرام میں پینل ڈسکشن

بعنوان "مرکزی مدرسہ بورڈ توقعات اور اندیشے" بھی رکھا گیا تھا جس میں پانچ طلبہ نے حصہ لیا، تمام شرکاء نے مرکزی مدرسہ بورڈ کو حکومت کی ایک سازش قرار دیا اور آخر میں متبادل کے طور پر کہا کہ حکومت اگر واقعی مسلمانوں کی فلاح و بہبود چاہتی ہے تو مدارس کے نام جائدادیں وقف کرے، مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی درجہ بحال کرے، مدارس کی اسناد کو منظوری دے تاکہ اس کے فارغین بھی مختلف میدانوں میں سرکاری سطح پر قوم و ملک کی خدمت کر سکیں۔

بعد نماز مغرب ایک رنگارنگ پروگرام طلبہ نے پیش کیا جس میں ڈرامہ، مکالمہ، ایکشن ترانہ، تمثیلی مشاعرہ وغیرہ شامل تھا۔

اختتامی نشست کی صدارت محترم مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے فرمائی۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ یہ پروگرام طلبہ کا ہے اس میں طلبہ کو اپنی صلاحیتیں نکھارنی چاہئے، بعض کمیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کے اندر جذبہ نہیں ہے تو بڑے سے بڑے ہتھیار سے بھی آپ فتح حاصل نہیں کر سکتے، مزید فرمایا کہ کبھی لوگ اس چکر میں رہتے ہیں کہ پوری دنیا بدل دیں مگر خود کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ اپنے آپ کو بدل سکیں، جب تک اپنی اصلاح خود نہیں کریں گے تب تک کسی طرح کی کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو استقامت علی الحق کی توفیق بخشے آمین!

۵۔ "مرکز تعلیم اساتذہ" کا قیام:

یہ خبر انتہائی خوشی و مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ جامعہ کی مجلس شوریٰ منعقدہ ۵۔۶ / مئی ۲۰۱۰ء نے اپنے طرز کا منفرد ادارہ "مرکز تعلیم اساتذہ..." کے نام سے قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کا باقاعدہ آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اس مرکز کا مقصد اساتذہ کی صلاحیتوں کو جلا بخشنا، تحقیقی ذہن پیدا کرنا اور اسلامی تناظر میں اساتذہ کی فکری و عملی تربیت کرنا ہے۔

☆☆☆

کونوا للناس کالشجر یرمونہ بالحجر
و یرمیھم بالثمر (حسن البناء الشہید)

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادران محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اللہ کرے آپ تمام احباب بخیر و عافیت ہوں۔

بحمد اللہ ۳۱ / دسمبر ۲۰۱۰ء کو انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کی کارواں میقات بخیر و خوبی اختتام پذیر ہو رہی ہے۔ دستور انجمن کی دفعہ ۱۳ / ۱ کے تحت میقات رواں کے اختتام سے قبل نئی میقات کے لئے انتخاب کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس سرکلر کے ذریعہ نئی میقات ۲۰۱۱ء ۔ ۲۰۱۳ء کا انتخابی عمل شروع کیا جا رہا ہے۔ پہلے مرحلہ میں دستوری دفعہ ۷ کے تحت مجلس نمائندگان کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ منعقدہ ۱۳ / جون ۲۰۱۰ء میں درج ذیل ضوابط طے کئے ہیں۔

(۱) اندرون ملک ۱۰ ممبر یا اس کے جز پر مجلس نمائندگان کے لئے ایک فرد کا انتخاب کیا جائے گا۔

(۲) بیرون ملک ہر ۲۰ یا اس کے جز پر ایک نمائندہ منتخب کیا جائے گا۔

ملک و بیرون ملک حلقہ جات کی فہرست درج ذیل ہے:

حلقہ جات (اندرون ملک)	حلقہ جات (اندرون ملک)
۱:- دہلی	۲:- مہاراشٹر
۳:- آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالا، تمل ناڈو	۴:- مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ
۵:- ہریانہ، راجستھان، پنجاب، گجرات	۶:- جموں کشمیر
۷:- بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ	۸:- بنگال، آسام، منی پور، نارتھ ایسٹ
۹:- علی گڑھ	۱۰:- اعظم گڑھ، مئو، بنارس، جونپور، الہ آباد، مرزاپور، بلیا وغیرہ
۱۱:- مشرقی یوپی، لکھنؤ، گورکھپور، دیوریا تک	۱۲:- مغربی یوپی، اترا کھنڈ، آگرہ، کانپور

حلقہ جات (بیرون ملک)	حلقہ جات (بیرون ملک)
۱۳:- سعودی عرب	۱۴:- قطر
۱۵:- کویت	۱۶:- عرب امارات
۱۷:- یو کے، یو ایس	۱۸:- نیپال

تمام ممبران انجمن کے نام انتخابی کمیٹی کے کنوینر جناب مولانا مقبول احمد فلاحی جملہ تفصیلات عنقریب ارسال کر رہے ہیں۔ آپ حضرات سے فعال تعاون کی درخواست ہے۔ والسلام

ڈاکٹر عبد الباری
سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم

الوداعی نظم

برائے فارغین جامعہ ۲۰۱۰ء

(نتیجۂ فکر: نوشاد اشہر اعظمی)

الوداع گہوارہ علم و ہنر اب الوداع
الوداع اے جامعہ کے بام و در اب الوداع

الوداع اے مادرِ علمی تری آغوش کو
زلفِ عنبر بیز کو تیرے رخِ خاموش کو
اپنی پلکوں پہ بسا کر تو نے فرزانہ کیا
اور مے سے علم کی لبریز پیمانہ کیا
ہوگئے دامن سبھی کے تر بتر اب الوداع

اپنے دامن میں چھپا کر قوتِ تسخیر دی
اک تبسم بھی دیا اک نالۂ تاثیر دی
سینچ کر اپنے لہو سے تو نے سنبل کردیا
آہ دے کر اپنے دل کی تو نے بلبل کردیا
پاگئے جینے کا مقصد بے خبر اب الوداع

اے چمن زارانِ الفت اے مرے جام و سبو
اے محبت کا سمندر تجھ سے میری آبرو
تیری شاخوں پہ چہکنا گنگنانا اب کہاں
بزمِ خوباں میں مچلنا مسکرانا اب کہاں
چھن گئی آزادیٔ شام و سحر اب الوداع

ماہتابِ وصل اپنا آج گہنا ہی گیا
آفتابِ ہجر میں جلنے کا دن آ ہی گیا
اپنی پلکوں پر سجا کر عشق کی تنویر کو
رکھ چلے ہیں خانۂ دل میں تری تصویر کو

اے چمن آ ہی گیا وقتِ سفر اب الوداع

ہائے کیسا تو نے ہم کو آج نذرانہ دیا
اپنی ارضی وابستہ کا تو نے پروانہ دیا
اے چمن اب تیرا بلبل مائلِ پرواز ہے
تیرے آنگن میں یہ اس کی آخری آواز ہے
ظلمتِ شب میں ہے تو مثلِ قمر اب الوداع

ہیں شمیم احمد، زبیر احمد سبھی سے بے خبر
بھر رہے ہیں اشک، ہیں دامن سبھی کے تر بتر
حالِ دل کیسے مبین احمد، عطاء سے ہو بیاں
دل میں اک طوفان ہے، آنکھوں میں موج بے کراں
ہوگئے تجھ سے جدا شوقِ نظر اب الوداع

اے زبیر احمد، ضیاء الحق یہ تم نے کیا کیا
وقت سے پہلے ہی تم نے داغِ فرقت دے دیا
آہ! اکمل عبدحاتم کس طرح آئے گی نیند
جب ستائے گی چمن کی یاد اور گفت و شنید
رو رہے ہیں آج سب شجر و حجر اب الوداع

اے بلال اوتم، مظفر دوستوں کو چھوڑ کر
جا رہے ہو تم کہاں پرویز دل کو توڑ کر
ہے حمید حاتم، عشاء الدین کے لب پر فغاں
خرمنِ دل سے وسیم احمد کے اٹھتا ہے دھواں
مخزنِ حکمت کے اے لعل و گہر اب الوداع

افتخار احمد، محمد مرتضیٰ، محسن، فہیم
عین الحق، اعجاز سے کہتے ہیں یہ عبدالحکیم
یاد آئے گی بہت سب دوستوں کی شوخیاں
جب ستائیں گی سفر میں راہ کی دشواریاں
جا رہے ہیں بزمِ یاراں چھوڑ کر اب الوداع

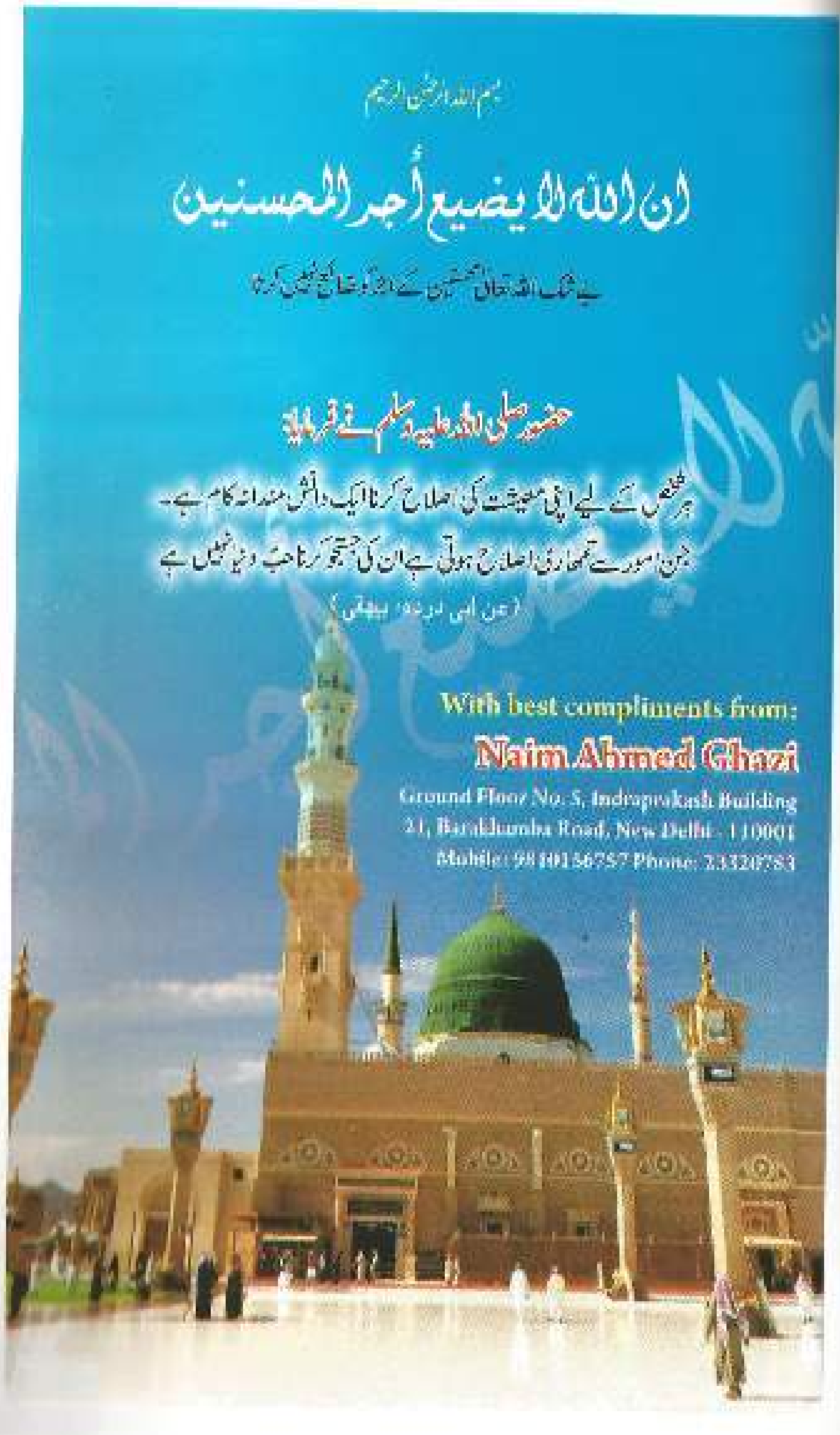

غم زدہ بیٹھے ہیں دیکھو عارف و طارق، سعید
دل گرفتہ ہیں بہت عبدالرحیم، عبدالحمید
خوب تڑپائے گی صبح و شام کی محفل ہمیں
یاد جب آئے گی صبح و شام کی محفل ہمیں
ہے بہت پرخار دنیا کی ڈگر اب الوداع

جب چمن سے بوئے گل بادِ صبا لے آئے گی
دل میں اک طوفاں اٹھے گا آنکھ نم ہو جائے گی
بلبلِ صد چاک تڑپیں گے رفاقت کے لئے
سازِ الفت کے لئے چشمِ عنایت کے لئے
خانۂ دل ہو گیا زیر و زبر اب الوداع

اے نگہبانِ چمن جینے کا کچھ سامان کر
یعنی ہم کو آشنائے لذتِ عرفان کر
پھونک دے تو روح اپنی لاشۂ بے جان میں
لذتِ پر کیف بھر دے بادۂ ایمان میں
کر ہمیں سب کی نظر میں معتبر اب الوداع

علم و حکمت کے گلوں سے ہم نے دامن بھر لیا
عزم کو اپنے جواں محکم یقین کو کر لیا
جا رہے ہیں شمعِ الفت ہم جلانے کے لئے
نغمۂ توحید دنیا کو سنانے کے لئے
کر دیا سوزِ جگر کو پر اثر اب الوداع

ہم رہیں اسلام پر زندہ مریں اسلام پر
وقف کر دیں زندگی اپنی خدا کے نام پر
آؤ ہم سب مل کے اکبر رب سے مانگیں یہ دعا
اس جہاں سے اس جہاں تک سربلندی ہو عطاء
اسوۂ فاروقؓ ہو پیشِ نظر اب الوداع

☆☆☆